www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

August 2014 • No. 453 • Rs. 20

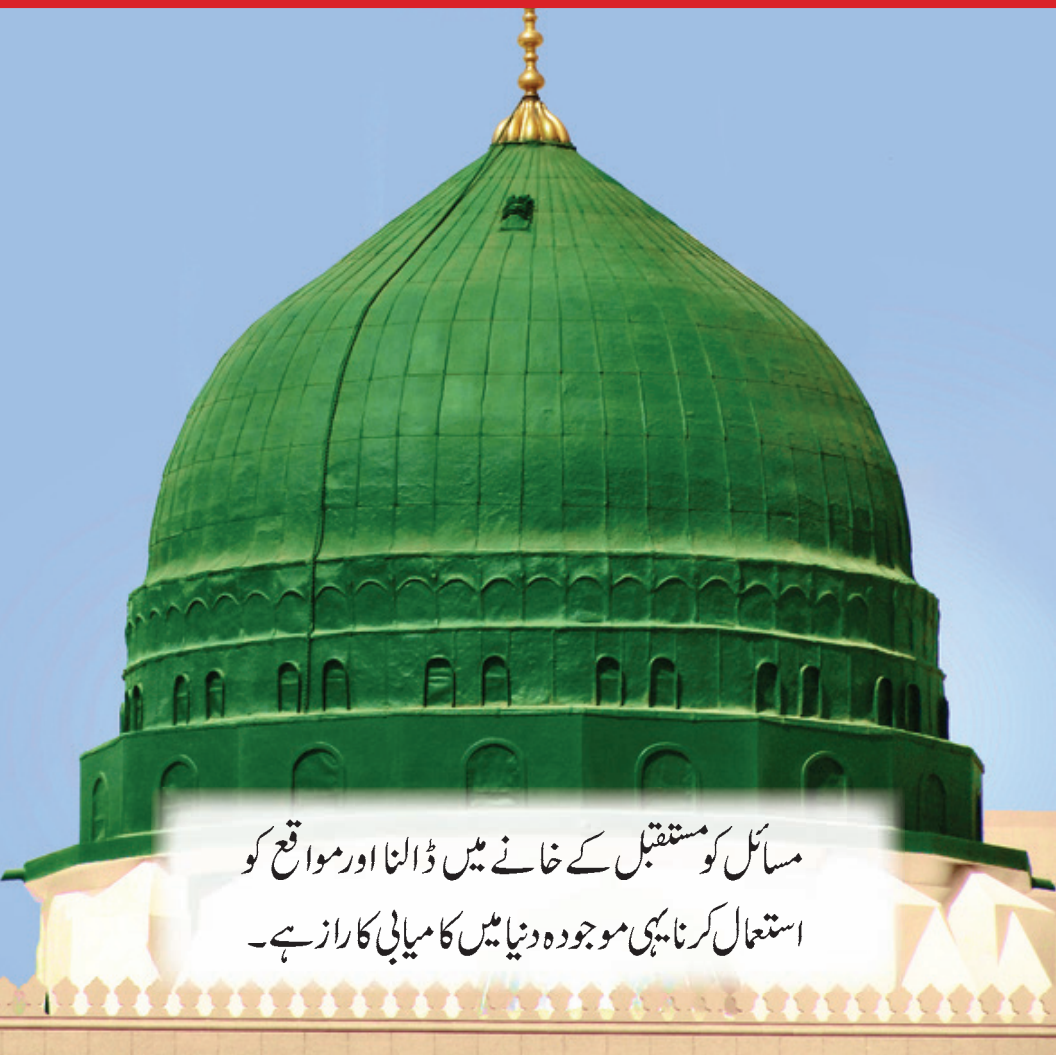

مسائل کو مستقبل کے خانے میں ڈالنا اور مواقع کو
استعمال کرنا یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز ہے۔

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 011-41827083, 46521511,
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹20
One year ₹200
Two years ₹400
Three years ₹600
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

اگست 2014

خصوصی شمارہ

قرآن اور حدیث

قرآن: کتابِ فطرت

قرآن کا مقصدِ نزول کیا ہے۔ اس کا جواب قرآن کی ایک ابتدائی آیت میں موجود ہے۔ سورہ البقرہ کی پہلی آیت یہ ہے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (2:2) یعنی یہ الکتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔

قرآن کی اِس آیت میں کتاب کے ساتھ 'الف لام' استعمال ہوا ہے، عربی قاعدہ کے مطابق، یہاں الکتاب میں (الف لام) عہد کا ہے، یعنی اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ یہ وہی کتابِ معہود (Promised Book) ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی فطرت جس رہنما کتاب کا تقاضا کر رہی تھی، قرآن وہی رہنما کتاب ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے جن سوالات کا جواب چاہتا تھا، اُن سوالات کا جواب اِس کتاب میں دیا گیا ہے۔ قرآن میں ''فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى'' (2:38) کے الفاظ میں اِسی کتابِ ہدایت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنی پیدائش کے اعتبار سے، ایک متلاشیِ حق حیوان ہے۔ ہر انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ جاننا چاہتا ہے کہ اس کا مقصدِ حیات (purpose of life) کیا ہے۔ زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے۔ انسان کے لیے ابدی سعادت کی صراطِ مستقیم کیا ہے۔ ہر عورت اور مرد کے دل میں یہ سوالات ہوتے ہیں، خواہ وہ اپنی زبان سے اِس کا اظہار کرے یا نہ کرے۔

اللہ تعالی نے انسانیت کے آغاز ہی سے اِس کا انتظام کیا۔ بار بار تاریخ میں ایسے پیغمبر آئے جو اِس سلسلے میں انسان کو اللہ کا کلام پہنچاتے رہے۔ لیکن پچھلے پیغمبروں کے ذریعے جو کلامِ الٰہی انسان کے پاس اللہ نے بھیجا تھا، بعد کو وہ اپنی اصل صورت میں محفوظ نہ رہا۔ اس کے بعد اللہ نے یہ کیا کہ ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں اس نے اپنی آخری کتاب قرآن نازل فرمائی اور یہ بھی فیصلہ کر دیا کہ یہ کتاب قیامت تک اپنی اصل حالت میں محفوظ رہے، تاکہ دوبارہ کسی نئے پیغمبر یا نئی کتاب کی ضرورت پیش نہ آئے۔

قرآن کو ابدی کتاب ہدایت کی حیثیت سے محفوظ کرنا کوئی سادہ بات نہ تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایسی جامع منصوبہ بندی کی جائے جو اسباب کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کلّی معنوں میں قرآن کی ابدی حفاظت کی ضامن بن جائے۔ اگر قرآن کامل معنوں میں محفوظ نہ رہے تو انسان کے لیے اس کی اہمیت مشتبہ ہو جائے گی۔

1۔ اِس مقصد کے لیے پہلی ضرورت یہ تھی کہ عربی زبان جو کہ قرآن کی زبان ہے، وہ قیامت تک ایک زندہ زبان (living language) کی حیثیت سے باقی رہے۔ چناں چہ عربی زبان کے حق میں یہ واقعہ پوری طرح پیش آیا۔ زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ چند سو سال کے بعد زبان اتنا زیادہ بدل جاتی ہے کہ بعد کے لوگ قدیم زبان کو سمجھ نہیں پاتے، مگر عربی زبان تمام معلوم زبانوں میں ایک استثنا (exception) کی حیثیت رکھتی ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں جو عربی زبان رائج تھی اور جس میں قرآن اتارا گیا، وہ عربی زبان آج بھی اپنی اصل صورت میں محفوظ ہے۔ عربی زبان کی گریمر اور اس کی لغات آج بھی وہی ہیں جو پہلے تھیں۔ علم الالسنہ کے ماہرین نے تسلیم کیا ہے کہ عربی زبان کی یہ صفت تمام زبانوں میں ایک استثنا ہے۔ چوں کہ اللہ تعالی کو قرآن کو محفوظ رکھنا تھا، اِس لیے اُس نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ قرآن کی زبان بھی کامل طور پر محفوظ رہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب ''پیغمبر انقلاب''، صفحہ: 181-169)۔

2۔ یہی معاملہ قرآن کے متن (text) کا ہے۔ اِس معاملے میں بھی اللہ نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ قرآن عربی کا متن کسی ادنی تغیر کے بغیر پوری طرح محفوظ رہے۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے زمانے میں تمام صحابہ کے اتفاق سے زید بن ثابت انصاری نے قرآن کا جو مکتوب نسخہ (written version) تیار کیا تھا، بعد کے زمانے میں قرآن کے جو نسخے تیار کیے گئے، وہ اِسی اولین نسخے کی کامل نقل تھے۔ حفاظتِ متن کا یہ سلسلہ اعلی اہتمام کے ساتھ تاریخ میں مسلسل جاری رہا، یہاں تک کہ پرنٹنگ پریس کا زمانہ آ گیا۔ آج قرآن کے مطبوعہ نسخے دنیا بھر میں بے شمار مدرسوں، مسجدوں، گھروں اور لائبریریوں میں موجود ہیں۔ یہ سب مطبوعہ نسخے زید بن ثابت انصاری کے

اولین نسخے کی کامل نقل ہوتے ہیں۔ محققین (scholars) نے لمبی تحقیق کے بعد اعتراف کیا ہے کہ قرآن کے متن میں ایک آیوٹا (iota) کے بقدر بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔

اللہ تعالی نے حفاظتِ قرآن کا یہ اہتمام اِس لیے کیا کیوں کہ اگر قرآن کے متن میں ادنی تغیر ہوجائے تو لوگوں کی نظر میں قرآن کا استناد (credibility) مشتبہ ہوجائے گی۔

3۔ اِسی طرح اللہ تعالی نے قرآن کے ساتھ ایک اور خصوصی معاملہ کیا اور وہ تھا قرآن کی تاریخ کا تحفظ۔ قرآن کی تاریخ ہر جزئی اور کلی اعتبار سے پوری طرح محفوظ ہے۔ اِس پر عربی زبان میں باقاعدہ کتابیں موجود ہیں۔ قرآن کی یہ تاریخ اتنی مکمل صورت میں لکھی گئی ہے کہ آج جو شخص اِن کتابوں کو پڑھے، وہ پوری طرح جان لے گا کہ قرآن کی حفاظت کا تاریخی اہتمام کس طرح کیا گیا ہے۔

4۔ یہی معاملہ قرآن کے معنی اور مفہوم کا ہے۔ مسلم اہلِ علم نے کثرت سے قرآن کی تفسیریں لکھیں اور قرآن سے متعلق علوم پر کتابیں تیار کیں۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ قرآن کی آیتوں کے معنی پوری طرح معلوم اور محقّق ہوگئے۔ یہ واقعہ بھی قرآن کی حفاظت کا ایک حصہ ہے۔ قرآن کے الفاظ جس طرح محفوظ کیے گئے، اُسی طرح قرآن کے الفاظ کے معانی بھی محفوظ کیے جاتے رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو محفوظ متن کی موجودگی میں بھی قرآن ایک ناقابلِ فہم مجموعہ بن جاتا۔ لوگ قرآن کے عربی الفاظ کو پڑھتے، لیکن وہ قرآن کے معنی ومفہوم سے بے خبر رہتے۔

مثال کے طور پر قرآن کی پہلی سورہ میں دین (1:4) کا لفظ آیا ہے۔ اِسی طرح قرآن کی سورہ یوسف میں بھی دین (12:76) کا لفظ آیا ہے۔ دونوں جگہ لفظ ایک ہے، مگر دونوں جگہ لفظ کے معنی مختلف ہیں، اور یہ فرق تواتر کے ذریعے پوری تاریخ میں منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ وہ آج کے لوگوں تک پہنچ گیا، وغیرہ۔

قرآن کے معنی کا یہ تحفظ بہت ضروری تھا۔ اگر یہ تحفظ موجود نہ ہوتا تو قرآن کے معانی کو سمجھنے میں بہت زیادہ اختلافات ہوتے۔ یہاں تک کہ یہ بھی ممکن تھا کہ قرآن کا عربی متن موجود ہو، اِس کے باوجود قرآن ایک ناقابلِ فہم کتاب بن جائے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اِس کتاب کے لیے اللہ نے مقدر کر دیا ہے کہ اِس میں باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہوسکتا ہے اور نہ اِس کے پیچھے سے۔ یہ خدائے حکیم اور حمید کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ (41:42)

اِس آیت میں آگے (before) سے مراد قرآن کے الفاظ ہیں اور پیچھے (behind) سے مراد ان الفاظ کے معانی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں نہ کوئی لفظی تبدیلی (change in words) ممکن ہے اور نہ کوئی معنوی تبدیلی (change in meaning)۔ قرآن کے تحفظ کے بارے میں اِس فیصلہ الٰہی کا تقاضا ہے کہ قرآن اول دن سے لے کر قیامت تک ان دونوں پہلوؤں کے اعتبار سے، کامل طور پر انٹیکٹ (intact) رہے۔ کسی ادنی وقفہ (gap) کے بغیر قرآن کی یہ محفوظیت مسلسل طور پر باقی رہے۔

یہ بات قرآن کے لفظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے، یکساں طور پر مطلوب ہے۔ قرآن کا لفظ جس طرح تاریخ میں کسی انقطاع کے بغیر منتقل ہو رہا ہے، اُسی طرح اس کا مفہوم بھی تاریخ میں کسی انقطاع کے بغیر کامل صحت کے ساتھ منتقل ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نعوذ باللہ قرآن کے بارے میں اللہ کا منصوبہ مکمل نہ ہوسکا، جو کہ بلاشبہہ ناممکن ہے۔

قرآن بظاہر ایک کتاب ہے، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہ ایک فیصلۂ خداوندی ہے۔ قرآن اللہ اور بندے کے درمیان برہان (4:174) ہے۔ برہان کا مطلب حجت ہے۔ دوسرے الفاظ میں، قرآن ایک مستند دستاویز (authoritative document) ہے۔

قرآن میں پیشگی طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ انسان سے اللہ کو کیا مطلوب ہے اور کس بنیاد پر انسان کے لیے ابدی عذاب یا ابدی انعام کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ قرآن کی اِس نوعیت کا تقاضا ہے کہ قرآن اپنے لفظ اور اپنے معنی دونوں اعتبار سے، کامل طور پر محفوظ رہے۔ قرآن کی یہ محفوظیت کسی جنگل میں یا کسی پہاڑ پر نہیں ہوسکتی۔ قرآن کی محفوظیت لازمی طور پر انسانوں کے درمیان ہوگی۔ ایسی حالت میں

قرآن کی لفظی اور معنوی حفاظت کا معیار وہی ہوگا جو دوسری کسی انسانی کتاب کا ہوسکتا ہے اور علمی تاریخ کے مطابق، وہ معیار یہ ہے کہ کتاب کے الفاظ اور اس کے معانی کا استعمال انسانوں کی ایک بڑی جماعت کے درمیان نسل در نسل (generation after generation) جاری رہے، تاریخ کے کسی بھی لمحے میں لوگوں کے درمیان ان کا تسلسل نہ ٹوٹے۔

تعبیر وتفسیر یا تحریف

قرآن کا عربی متن (text) محفوظ حالت میں ہر جگہ موجود ہے۔ کسی بھی صاحبِ علم آدمی کے لیے یہ موقع ہے کہ وہ آبجکٹیو (objective) انداز میں مطالعہ کرکے قرآن کے معنی میں نئے پہلوؤں کی نشان دہی کرے۔ قرآن کی بنیادی تعلیم ایک ہے اور وہ ہمیشہ ایک رہے گی، لیکن قرآن کی آیتوں میں نئے پہلوؤں کی دریافت ہمیشہ جاری رہے گی، جیسا کہ خود حدیث میں قرآن کے بارے میں آیا ہے: لا تنقضي عجائبه (سنن الترمذي، رقم الحديث: 2906) یعنی قرآن کے عجائب (wonders) کبھی ختم نہ ہوں گے۔

لیکن اِس مطالعہ قرآن کی دو صورتیں ہیں — ایک ہے، تعبیر (interpretation) کا طریقہ اور دوسرا ہے، تحریف (distortion) کا طریقہ۔ قرآن میں نئی تعبیرات کی گنجائش ہمیشہ باقی رہے گی، لیکن تحریف کی گنجائش یقینی طور پر نہیں۔ اِس معاملے کی مزید وضاحت کے لیے یہاں کچھ مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر قرآن میں اہلِ جہنم کے بارے میں آیا ہے کہ: قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (74:43)۔ قرآن کی اِس آیت میں 'مصلین' کا لفظ آیا ہے، لیکن یہاں صلوۃ کی عملی صورت کا ذکر نہیں ہے، اب اگر کوئی شخص کہے کہ یہاں 'مصلین' سے مراد پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنے والے لوگ ہیں تو یہ ایک جائز تعبیر وتفسیر ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اِس آیت میں 'مصلین' سے مراد وہ لوگ ہیں جو سماجی تنظیم (social organization) میں شامل تھے، تو یہ آیت کی ایک محرَّف (distorted) تشریح ہوگی جو علمی طور پر قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔

اِس معاملے کی ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن کی ایک آیت یہ ہے: وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (16:8) یعنی خدا نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے، تاکہ تم اُن پر سوار ہو اور زینت کے لیے بھی، اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

قرآن کی اِس آیت میں انسان کے بری سفر اور بحری سفر کا ذکر ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ 'ویخلق ما لا تعلمون' کے الفاظ میں ہوائی سفر کا ذکر ہے جس کی ٹکنالوجی بوقتِ نزولِ قرآن نیچر میں موجود تھی اور بعد کو انسان اِس مخفی ٹکنالوجی کو دریافت کرکے ہوائی جہاز بنانے والا تھا اور برّی اور بحری سفر کے علاوہ ہوائی سفر کا بھی اس میں اضافہ کرنے والا تھا۔ اگر کوئی شخص قرآن کی اِس آیت کی یہ تفسیر کرے تو وہ ایک جائز تفسیر ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ 'ویخلق ما لا تعلمون' کے الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی ایک اور آتشی مخلوق ہے جو ستاروں کی دنیا میں رہتی ہے تو یہ بلاشبہہ ایک بے بنیاد تعبیر وتفسیر ہوگی جو علمی طور پر ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قرآن کے بارے میں اللہ کا یہ فیصلہ پوری طرح واقعہ بنا۔ یہی وجہ ہے کہ نزولِ قرآن کے چودہ سو سال بعد آج بھی بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے درمیان قرآن کے الفاظ اور اس کے معانی دونوں اُسی طرح معلوم اور مالوف ہیں جیسا کہ وہ نزولِ قرآن کے وقت تھے۔ اِس درمیان میں نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ غیر مسلم اہلِ علم نے قرآن کا گہرا مطالعہ کیا اور غیر مشتبہ طور پر اس کو سمجھتے رہے۔ قرآن کے بارے میں لوگوں کی اِس معرفت (understanding) کی تصدیق انسانوں کے ذریعے براہِ راست بھی کی جاسکتی ہے، اِس کے علاوہ قرآن کے موضوع پر لکھی ہوئی بے شمار کتابیں دنیا بھر کے کتب خانوں میں موجود ہیں، اِن کتابوں کا مطالعہ بھی قرآن کے بارے میں مذکورہ حقیقت کی بالواسطہ تصدیق کرتا ہے۔

قرآن اور لسانیات

زبان (language) انسان کی ایک امتیازی صفت ہے۔ تمام حیوانات میں انسان واحد مخلوق ہے جو سوچتا ہے اور پھر اپنی سوچ کو نطق (speech) کی صورت میں بیان کرتا ہے۔ نطق کی

اِس صلاحیت کا اظہار ہمیشہ الفاظ کے ذریعے ہوتا ہے، مگر الفاظ کوئی جامد (static) چیز نہیں۔ جس طرح انسان کے اندر فکر کا عمل (thought process) ہمیشہ ارتقا کرتا رہتا ہے، اِسی طرح زبان میں بھی ہمیشہ ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔ فکر اور زبان دونوں یکساں طور پر ارتقا پذیر حقیقتیں ہیں، نہ کہ جامد حقیقتیں۔

مثال کے طور پر قدیم زمانے میں انسان نے جنگلوں میں ایک حیوان کو دریافت کیا جو کہ انسانی سواری کے لیے نہایت موزوں تھا۔ انسان نے اپنی زبان میں اس کو گھوڑا (horse) کا نام دیا۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے ارتقا ہوا اور گھوڑے کے ساتھ گاڑی کا تصور شامل ہوا۔ اب ایک نئی سواری وجود میں آئی جس کو گھوڑا گاڑی (horse cart) کہا جانے لگا۔ اِس طرح گھوڑے کے لفظ میں ایک استعمالی اضافہ ہوا۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں مزید ترقی ہوئی اور انسان نے بھاپ کی طاقت (steam power) کو دریافت کیا۔ اب بھاپ کی طاقت کو بتانے کے لیے گھوڑے کے لفظ کا ایک نیا استعمال وجود میں آیا جس کو ہارس پاور (horse power) کہا جاتا ہے۔ اِن تینوں الفاظ میں ایک مشترک مفہوم پایا جاتا ہے۔ اِس کے باوجود تینوں کے معنی الگ الگ ہیں، اور یہ الگ الگ مفہوم انسانوں کے درمیان اِن الفاظ کے استعمال سے تدریجی طور پر بنا ہے۔

یہی ہر زبان کا معاملہ ہے۔ ہر زبان میں لفظ کے اصلی مفہوم کے ساتھ ہمیشہ اس کے استعمالی مفاہیم پائے جاتے ہیں، اور یہ استعمالی مفہوم اہلِ زبان کے درمیان اُن کے مسلسل لکھنے اور بولنے سے زبان کا حصہ بنتے ہیں۔ اہلِ زبان کے درمیان کسی انقطاع کے بغیر جاری اِس عمل کو لسانی تواتر (linguistic continuation) کہا جاتا ہے۔

دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی یہی عمل پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عربی زبان کا ایک لفظ زکا، یزکو ہے۔ اس لفظ کا ابتدائی مفہوم بڑھنا (to flourish) ہے۔ اِس لحاظ سے یہ لفظ جمود کی ضد ہے۔ پہلے یہ لفظ اپنے ابتدائی مفہوم میں استعمال ہوتا تھا، لیکن اسلام میں جب مال کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم آئی تو معنوی قربت کی بنا پر اِس کے لیے 'زکوۃ' کی اصطلاح اختیار کی گئی۔ کیوں کہ اسلام کا تصور یہ ہے کہ انفاق کا مطلب صرف خرچ نہیں، بلکہ اِس سے مال میں اضافہ

ہوتا ہے، وہ مال میں برکت کا ذریعہ ہے۔

اِسی طرح اسلام میں ایک اور تعلیم آئی جس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کے اندر روحانی ارتقا (spiritual development) لایا جائے، انسان کی فطرت میں چھپے ہوئے روحانی امکان کو انفولڈ (unfold) کیا جائے۔ اِس مفہوم کے لیے بھی قریب تر لفظ یہی تھا۔ چناں چہ اِس عمل کو تزکیہ کہا گیا۔ اِس مفہوم کے اعتبار سے تزکیہ کا لفظ اسلام کا ایک اصطلاحی لفظ بن گیا اور اِس معنی میں وہ لوگوں کے درمیان استعمال ہونے لگا۔ تقریر اور تحریر کے متواتر استعمال سے تزکیہ کا یہ اصطلاحی مفہوم پوری طرح معلوم اور متعین ہو گیا، حتی کہ اب اہلِ زبان اور اہلِ علم کے درمیان اِس لفظ کے اصطلاحی مفہوم پر کوئی اشتباہ موجود نہیں۔

یہی مثال پورے قرآن پر صادق آتی ہے۔ قرآن کا متن عربی زبان میں ہے۔ قرآن میں کُل 114 سورتیں ہیں۔ قرآن میں استعمال ہونے والے عربی الفاظ کی تعداد 86430 شمار کی گئی ہے۔ یہ الفاظ کہیں اپنے اصلی معنی کے اعتبار سے ہیں اور کہیں استعمالی معنی کے اعتبار سے اور کہیں قرآن کی اپنی اصطلاح کے اعتبار سے۔ قرآن کے عربی الفاظ کے یہ تمام مفاہیم تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، یہ مفاہیم غیر مشتبہ طور پر معلوم ہیں۔ چودہ سو سال کی مدت میں اہلِ زبان اور اہلِ علم کے درمیان متواتر استعمال کے نتیجے میں اِن الفاظ کا مفہوم غیر مشتبہ طور پر متعین ہو گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص قرآنی الفاظ کے اِن ثابت شدہ استعمالی مفاہیم کو نہ مانے، تو اس کا کیس علم کا کیس نہیں، بلکہ اس کا کیس ایک بدیہی امر کے انکار کا کیس ہے اور ایسے انکار کی علم اللسان کے اعتبار سے بلاشبہہ کوئی قیمت نہیں۔

زبان اور اس کا استعمال

زبان (language) کیا ہے۔ زبان ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے۔ زبان کا بنیادی عمل خیالات کا اظہار (expression of thought) ہے۔ (E.B:/10/643)

ہر زبان ابتداءً صرف بول چال کی زبان (dialect) ہوتی ہے، پھر استعمال کے دوران دھیرے دھیرے وہ لکھنے کی زبان بنتی ہے۔ مثلاً انگریزی زبان ہزار سال پہلے صرف بول چال کی

زبان تھی۔اس کے بعد وہ ترقی کر کے لکھنے کی زبان بنی۔ابتدا میں انگریزی زبان کے الفاظ کی تعداد بہت کم تھی، جب کہ اکیسویں صدی میں انگریزی زبان کے الفاظ کی تعداد بڑھتے بڑھتے ایک ملین سے زیادہ ہوچکی ہے۔

کسی زبان میں الفاظ کا اضافہ بنیادی طور پر دو طریقے سے ہوتا ہے۔ایک ہے خارجی کلچر کے اختلاط سے زبان کے الفاظ میں اضافہ ہونا۔مثلاً کیلنڈر (calendar) اصلاً لاتینی زبان کا لفظ (calendarium) تھا۔اس کے بعد وہ انگریزی میں شامل ہوکر انگریزی زبان کا حصہ بن گیا۔ الفاظ کا یہ اضافہ ہر زبان میں ہوتا ہے اور وہ مسلسل طور پر جاری رہتا ہے۔

زبان میں الفاظ کے اضافے کا دوسرا طریقہ وہ ہے جو استعمال (usage) کے ذریعے ہوتا ہے۔تقریباً ہر لفظ کے معنی میں استعمال کے ذریعے اضافہ ہوتا رہتا ہے۔یہ عمل ہر زبان میں ہوتا ہے۔ کسی بھی زبان کی ڈکشنری کو دیکھ کر یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح الفاظ کے مفہوم میں اضافے کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔کسی لفظ کے ابتدائی معنی کو لغوی معنی کہا جاتا ہے اور اس کے اضافہ شدہ معنی کو استعمالی معنی۔لفظ کے معنی میں استعمال کی بنا پر اضافے کی ایک صورت وہ ہے جس کو اصطلاح (term) کہا جاتا ہے۔ہر زبان میں یہ اصول رائج ہے۔اِس پر باقاعدہ ڈکشنریاں بنائی گئی ہیں جن میں الفاظ کے اصل معنی کے ساتھ اس کے اصطلاحی معنی بھی بتائے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر انگریزی زبان میں ایک لفظ گیس (gas) ہے۔لفظ گیس کا ابتدائی مفہوم انتشار (chaos) تھا۔بعد کو یہ لفظ اصطلاح بن کر گیس کے موجودہ کیمیاوی معنی میں استعمال ہونے لگا۔گیس کی یہ اصطلاح سترھویں صدی عیسوی میں بنی۔بلجیم کے ایک سائنس داں وان ہیل مانٹ نے گیس کے لفظ کو کیمسٹری کی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا:

> "Gas" formed in the 17th century by the Belgian chemist and physician Jan Baptist Van Helmont (1577-1644) as a technical term in chemistry. (EB:10/652)

اِسی طرح لفظ کے استعمالی معنی کی ایک مثال وہ ہے جس کو مجازی معنی (metaphor)

کہا جاتا ہے۔ الفاظ کو مجازی معنی میں استعمال کرنے کا طریقہ ہر زبان میں کثرت سے رائج ہے۔ کوئی لفظ جب مجازی معنی میں استعمال ہو تو لفظ اگر چہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے وہی رہتا ہے، لیکن باعتبارِ استعمال اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً ایک بہادر آدمی کو اگر یہ کہا جائے کہ تم شیر ہو تو شیر کا لفظ اگر چہ وہی رہے گا، لیکن اس کے معنی میں ایک نیا مفہوم شامل ہو جائے گا۔ اب وہ لفظ اپنے اصلی معنی کے بجائے اپنے مجازی معنی کے اعتبار سے مراد ہوگا۔

اِس معاملے کی ایک مثال فرانسیسی فلاسفر روسو (Jean Jacques Rousseau) کی کتاب ہے۔ اِس کتاب کا فرانسیسی نام یہ تھا— کنٹراٹ سوشیال (*Contrat Social*)۔ یہ کتاب فرانسیسی زبان میں 1762 میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں اِس نام سے کیا گیا— سوشل کنٹریکٹ (*Social Contract*)۔ روسو کی یہ کتاب حسب ذیل جملے سے شروع ہوتی ہے— انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chains.

اِس جملے میں زنجیر (chain) کا لفظ اپنے اصلی معنی کے اعتبار سے استعمال نہیں ہوا ہے، بلکہ وہ اپنے مجازی معنی کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں روسو کے لفظ کو مجازی معنی کے اعتبار سے نہیں لوں گا، بلکہ میں اس کو اس کے لغوی معنی کے اعتبار سے لوں گا، تو روسو کا یہ جملہ بالکل بے معنی ہو جائے گا۔ کیوں کہ روسو کا مطلب یہ نہیں تھا کہ انسان حقیقی معنوں میں لوہے کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے۔ روسو نے اِس لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کیا تھا، یعنی سیاسی زنجیر یا سیاسی بندھن کے معنی میں۔

اصطلاح سازی کا یہ طریقہ ہر زبان میں بلا اختلاف رائج ہے۔ ہر زبان میں ہر موضوع پر بے شمار اصطلاحات وضع ہوئی ہیں جو مسلسل طور پر کتابوں میں استعمال ہوتی ہیں۔ علم کی ترقیاں اصطلاح سازی کے اِسی اصول پر قائم ہیں۔ ہر موضوع کی کتابیں اِس قسم کی اصطلاحات سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں لفظ کے اصطلاحی معنی کو نہیں، بلکہ ہر لفظ کو اس کے ابتدائی لغوی معنی میں لوں گا تو علمی ترقی کا خاتمہ ہو جائے گا اور کتب خانوں میں جمع شدہ کتابیں عملاً ناقابلِ فہم

دستاویز بن کر رہ جائیں گی۔

مثال کے طور پر جرمن سائنس داں میکس پلانک (Max Planck) نے طبیعیات میں ایک نظریہ دریافت کیا۔ اِس نظریے کو کوانٹم تھیوری (Quantum Theory) کہا جاتا ہے۔ کوانٹم تھیوری کا مطلب یہ ہے کہ انرجی کا عمل مسلسل انداز میں نہیں ہوتا، بلکہ وہ غیر مسلسل انداز میں ہوتا ہے:

Quantum Theory: The theory that energy is not absorbed nor radiated continuously but discoutinuously in definite units called *quanta.*

اب اگر کوئی شخص یہ کرے کہ وہ کوانٹم تھیوری کی ترکیب کو اس کے اصطلاحی معنی میں نہ لے، بلکہ وہ ''کوانٹم'' کے لفظ کو اس کے ابتدائی لغوی معنی (مقدار) میں لے کر اس پر بحث کرے تو اس کی ساری بحث آخری حد تک غیر علمی ہوگی۔ اور اگر اس کے اصول کو مان لیا جائے تو کوانٹم تھیوری کے موضوع پر لکھی ہوئی تمام کتابیں ایک ناقابلِ فہم دستاویز بن کر رہ جائیں گی۔

زبان کے معاملے میں یہی اصول ہر شعبہ علم میں رائج ہے۔ اسلام میں بھی اس کو اِسی اعتبار سے استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن میں بہت سے الفاظ ہیں جو بطور اصطلاح استعمال ہوئے ہیں، یعنی ایک مفہوم بتانے کے لیے کسی قریبی لفظ کو اختیار کرنا۔ مثلاً صلوۃ، صوم، زکوۃ، حج، وغیرہ۔ اِن الفاظ کا ایک ابتدائی لغوی مفہوم ہے، لیکن قرآن میں اس کو اصطلاحی معنی کے اعتبار سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اصطلاحی مفہوم تاریخ میں مسلسل طور پر جاری رہا۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ اِن الفاظ کو وہ اس کے معروف اصطلاحی معنی کے برعکس صرف اس کے لغوی معنی میں لے اور پھر اس کا خود ساختہ مفہوم بتا کر اس پر بحث شروع کر دے تو اس کی ساری بحث بلاشبہہ بے بنیاد (baseless) قرار پائے گی۔ اِس قسم کی بحث کی کوئی قیمت نہ علمی اعتبار سے ہوگی اور نہ اسلامی اعتبار سے۔

زبان اور معنی کا تاریخی تواتر

ہر زبان کا یہ اصول ہے کہ اس کے الفاظ کے معنی اہلِ زبان کے استعمال سے متعین ہوتے ہیں۔ مجلسوں میں، تعلیم گاہوں میں، غرض ہر جگہ لمبی مدت تک اُن کا استعمال جاری رہتا ہے اور اُس پر ڈکشنریاں

بھی لکھی جاتی ہیں۔ اِس طرح لمبی مدت کے عمل کے بعد اہلِ زبان اور اہلِ علم کے درمیان الفاظ کے مفاہیم مسلّمہ طور پر متعین ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ زبان جاننے والوں کے درمیان الفاظ کے مفاہیم پر کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا۔ یہی ہر زبان میں ہوتا ہے اور یہی معاملہ اسلام میں بھی پیش آیا ہے۔

قرآن ساتویں صدی کے ربع اول میں عربی زبان میں اترا۔ عربی زبان اُس وقت ایک تحریری زبان بن چکی تھی۔ اُس وقت سے اب تک عربی زبان ایک زندہ زبان کے طور پر زمین کے ایک بڑے رقبے میں رائج ہے۔

قرآن نے جن الفاظ کو لغوی یا اصطلاحی معنی میں استعمال کیا تھا، وہ رسول کے معاصرین کے درمیان بڑے پیمانے پر اُسی مفہوم میں دہرائے جاتے رہے۔ اس کے بعد ایک بڑی انسانی آبادی میں نسل در نسل برابر یہ سلسلہ جاری رہا۔ مسلم معاشرے کے علاوہ، مسجدوں میں اور مدرسوں میں اور اداروں میں بڑے پیمانے پر اِن اصطلاحات کا مسلسل چرچا ہوتا رہا۔ اِن پر کثرت سے کتابیں اور ڈکشنریاں لکھی گئیں۔ اِس عمل (process) کو علمی زبان میں تواتر کہا جاتا ہے۔ اِس تواتر (continuation) نے قرآن کے الفاظ اور اس کی اصطلاحات کو غیر مشتبہ طور پر ایک بڑے انسانی گروہ کے درمیان معلوم اور مسلّم بنا دیا۔

اِس معاملے کو تاریخی تواتر (historical continuation) کہا جاسکتا ہے۔ یہی تاریخی تواتر ہر زبان کے کتب خانے کو علوم کا مستند ماخذ بنائے ہوئے ہے۔ یہی تاریخی تواتر قرآن کے مفاہیم کو سمجھنے کے لیے بھی پوری طرح موجود ہے۔ جو اصول دوسرے علمی شعبوں کی کتابوں کو ناقابلِ انکار حقیقت کا درجہ دئے ہوئے ہے، وہی اصول قرآن اور اس کے الفاظ واصطلاحات کو بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت کا درجہ عطا کرتا ہے۔

اِس معاملے میں جو لوگ قرآن کے الفاظ واصطلاحات پر شک کریں، وہ صرف قرآن کے الفاظ واصطلاحات پر شک نہیں کررہے ہیں، بلکہ وہ علوم کی پوری تاریخ کو عملاً منسوخ قرار دے رہے ہیں، اور اِس قسم کی منسوخی کے بارے میں بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بلاشبہہ وہ بداہۃً ہی

قابل رد ہے۔(Prima facie it stands rejected)

اِسی طرح انگریزی زبان کا ایک لفظ ایوالو (evolve) ہے جو لاتینی زبان سے آیا ہے۔ اِس لفظ کا ابتدائی مطلب کھولنا (unfolding) ہے۔ یہ لفظ ابتداءً اِسی مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ اِس کے بعد انیسویں صدی میں برٹش سائنس داں چارلس ڈارون (وفات: 1882) نے اپنا ایک حیاتیاتی نظریہ بنایا جس کو اب عام طور پر نظریہ ارتقا (theory of evolution) کہا جاتا ہے۔ ڈارون کے بعد ایولوشن (evolution) کا لفظ ایک مخصوص حیاتی نظریہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اب اِس لفظ کا اصطلاحی مطلب یہ ہوگیا کہ تمام انواعِ حیات ایک ہی نوع میں عضویاتی ارتقا کے ذریعے لمبی مدت کے دوران وجود میں آئی ہیں:

> Evolution: The theory, now generally accepted, that all species of plants and animals developed from earlier forms by hereditary transmission of slight variations in successive generations.

ایولوشن (evolution) کے لفظ کا یہ اصطلاحی مفہوم اب اہلِ علم کے درمیان ایک معروف اور مسلّم مفہوم بن چکا ہے۔ اِس کا سبب لمبی مدت تک لفظ کے اِس اصطلاحی مفہوم کا استعمال ہے۔ لمبی مدت کے دوران جس طرح لفظ ''ایولوشن'' تاریخ میں نسل در نسل سفر کر رہا تھا، اُسی طرح لفظ کا یہ مفہوم بھی لفظ کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا۔

اِس دوران لفظ میں اور اس کے مفہوم میں کبھی جدائی نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ چارلس ڈارون کے زمانے میں اِس لفظ کا جو مفہوم لوگوں نے سمجھا تھا، اِس لفظ کو پڑھ کر یا سن کر عین وہی مفہوم آج کے لوگ بھی سمجھتے ہیں جو ڈارون کے ہم عصر لوگوں نے سمجھا تھا۔ ''ایولوشن'' کا یہ اصطلاحی مفہوم اب اتنا زیادہ مسلّم (establish) ہو چکا ہے کہ اگر کوئی شخص ڈارون یا اس کے بعد کے حیاتیاتی مفکرین کی کسی کتاب میں ''ایولوشن'' کا لفظ پڑھے اور اس کو قدیم لغوی معنی میں لے کر یہ کہے کہ اس کا مطلب صرف کھولنا (unfolding) ہے، تو یہ بات اتنی زیادہ مضحکہ خیز (ridiculous) ہوگی کہ کوئی صاحبِ علم

اس کا جواب دینے کو صرف اپنے وقت کا ضیاع سمجھے گا۔

زبان اور تسلسل

تسلسل ہر زبان کا لازمی حصہ ہے۔ تسلسل کے بغیر زبان کی مثال ایسی ہوجائے گی جیسے کھدائی (excavation) کے ذریعے دریافت کی ہوئی پتھر کی ایک تختی (slab) جس پر کسی معدوم زبان کی ایک عبارت لکھی ہوئی ہو، لیکن آج کوئی شخص اس کو سمجھ نہ سکے۔ کیوں کہ پتھر کی اِس تختی اور آج کے انسان کے درمیان طویل تاریخی بُعد (historical gap) واقع ہے۔ ایک طویل زمانے تک لوگوں کے درمیان اِس حجری زبان (stone language) کو لکھنے اور بولنے کا عمل جاری نہ رہا۔ اِس طرح اِس زمانی بعد کی بنا پر یہ حجری زبان لوگوں کے لیے ناقابلِ فہم بن گئی۔

مثال کے طور پر دستورِ ہند (Constitution of India) کو ڈاکٹر امبیڈکر اور ان کے ساتھیوں نے لکھا، پھر اِس دستور کا متن (text) کتاب کی صورت میں چھاپا گیا، پھر انڈیا کی دستور ساز اسمبلی میں اُس پر بحث ومباحثہ ہوا۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک انڈیا کے سپریم کورٹ کے ججوں اور وکیلوں اور قانون کے طلبا کے درمیان وہ بار بار زیر بحث آیا، پھر دستور کے موضوع پر کثیر تعداد میں کتابیں اور مقالات لکھے جاتے رہے۔ اِس طرح انڈیا کی آزادی (1947) سے اب تک دستورِ ہند کے مندرجات مسلسل طور پر لوگوں کے درمیان چرچا کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ یہی وہ تسلسل ہے جو دستورِ ہند کو ایک قابلِ فہم قانونی دستاویز بنائے ہوئے ہے۔ اگر تسلسل کی اِس تاریخ کو حذف کر دیا جائے تو دستور ہند ایک ناقابلِ فہم دستاویز بن کر رہ جائے گا، حتی کہ اس کی قانونی اہمیت ہی ختم ہوجائے گی۔

ہر زبان الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ الفاظ کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے اس کی آواز یا تلفظ اور دوسرا پہلو ہے اس کی معنویت۔ اِن دونوں پہلوؤں کے زندہ رہنے سے کوئی زبان زندہ رہتی ہے۔ مثلاً انگریزی زبان کا ایک لفظ اینف (enough) ہے۔ اس کے معنی کافی کے ہیں۔ اینف کا تلفظ بھی صوتی تسلسل (continuation of meaning) کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچ رہا ہے۔

اِسی طرح اینف کا مفہوم بھی معنوی تسلسل (continuation of meaning) کے ذریعے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچ رہا ہے۔ یہی نسل در نسل تسلسل (continuation) وہ چیز ہے جو زبان کے تلفظ اور اس کے معنی دونوں کو تاریخ میں اپنی اصل ابتدائی صورت میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔

تسلسل یا تواتر (continuation) کا یہ تاریخی اصول جس طرح دوسری زبانوں کی کتابوں پر صادق آتا ہے، ٹھیک اُسی طرح وہ قرآن کی زبان کے بارے میں بھی درست ہے۔ قرآن کی زبان بھی معنی اور تلفظ دونوں اعتبار سے تاریخ میں نسل در نسل سفر کر رہی ہے۔ یہ تاریخی تسلسل (historical continuation) تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے لوگوں کے درمیان کسی انقطاع (discontinuity) کے بغیر جاری ہے۔ اِس تاریخی تسلسل نے قرآن کو کامل معنوں میں ایک محفوظ اور قابلِ فہم کتاب بنا دیا ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ تاریخی واقعہ ہے۔ جو لوگ اِس واقعے کو نہ مانیں، وہ خود اپنے کیس کو مشتبہ بنا رہے ہیں، نہ کہ قرآن میں استعمال ہونے والے الفاظ واصطلاحات کو۔

زبان کی تاریخ

انسان کی تعریف (definition) یہ کی جاتی ہے کہ اس کے اندر تصوراتی فکر (conceptual thinking) کی صلاحیت ہے۔ چناں چہ انسان کے ذہن میں پہلے کسی چیز کا تصور آتا ہے، اس کے بعد اس کے لیے الفاظ وضع ہوتے ہیں۔ مثلاً پہاڑ کو دیکھ کر پہاڑ جیسی چیز کا تصور پہلے آیا، اس کے بعد اِس فطری ظاہرے کو بتانے کے لیے پہاڑ (mountain) کا لفظ وضع ہوا۔ ایسا نہیں ہے کہ پہاڑ کا لفظ پہلے وضع ہوا ہو اور اس کے بعد انسان نے پہاڑ کو دریافت کر کے اُس کو ''پہاڑ'' کا نام دیا ہو۔

یہی معاملہ اُن تعبیری الفاظ کا ہے جو قرآن میں استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً انسان کے ذہن میں مسجد کا تصور (concept) پہلے آیا، اس کے بعد عبادت کے لیے بننے والی عمارت کو مسجد کہا جانے لگا۔ اِسی طرح انسانی ذہن میں (صلوۃ) کا تصور پہلے آیا، اس کے بعد عبادت کی ایک مقرر صورت کو صلوۃ

کہا جانے لگا۔ اِس کے بعد یہ ہوا کہ بہت سے لوگ مقرر اوقات میں اجتماعی طور پر کھلے مقامات پر اعلان کے ساتھ اقامتِ صلوۃ کا فریضہ انجام دینے لگے۔ اِس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوا کہ نماز کی عبادت تمام لوگوں کے لیے اُسی طرح معلوم اور معروف واقعہ بن گئی جس طرح اِس نوعیت کی دوسری تمام اجتماعی روایات ایک معروف واقعہ بنی ہوئی ہیں۔

زبان کسی خلا (vacuum) میں سفر نہیں کرتی، زبان ہمیشہ تاریخ میں سفر کرتی ہے۔ جس طرح انسان تاریخ میں سفر کرتا ہے، اُسی طرح انسان کی زبان بھی تاریخ میں سفر کرتی ہے۔ زبان کی تاریخ زبان کو ایک قابلِ فہم تسلسل بناتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کرے کہ وہ زبان کو اس کی تاریخ سے الگ کر کے اس کا مطالعہ کرے تو یقینی طور پر وہ غلطی کرے گا۔ وہ نہ تاریخ کو درست طور پر سمجھ سکے گا اور نہ زبان کو۔

چند مثالیں

قرآن کی آیتوں کو سمجھنے کے لیے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ قرآن کی آیتوں میں جو الفاظ لغوی معنی میں آئے ہیں، اُن کو لغوی معنی میں لیا جائے اور جو الفاظ استعمالی مفہوم میں آئے ہیں، اُن کو اُن کے استعمالی مفہوم میں لیا جائے، خواہ وہ مجاز کے مفہوم میں ہوں یا اصطلاحی مفہوم میں یا کسی اور مفہوم میں۔ الفاظ کا یہ مفہوم ان کے استعمالی تواتر سے معلوم ہوگا، نہ کہ صرف ڈکشنری کے آزادانہ استعمال سے۔ الفاظ کا یہ استعمالی مفہوم لوگوں کے درمیان نسل در نسل کے تاریخی تواتر سے متعین ہوگیا ہے۔ الفاظ کا یہ استعمالی مفہوم آج بھی اہلِ علم کے درمیان تمام اسلامی اداروں میں غیر مشتبہ طور پر رائج ہے۔ الفاظ کا یہ اصطلاحی مفہوم ہزاروں کتابوں میں مسلسل طور پر ریکارڈ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اِن کتابوں سے اصلاً وہ کتابیں مراد ہیں جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ یہ علمی کتابیں پہلے مخطوطات اور مطبوعات کی صورت میں کتب خانوں میں تھیں، اب وہ انٹرنیٹ کی صورت میں ہر جگہ آن لائن موجود ہیں اور اب اس پر مزید اضافہ یہ ہوا ہے کہ یہ ڈیجیٹل فارمٹ (digital format) میں ہر جگہ آن لائن اور آف لائن موجود ہیں۔

مثال کے طور پر قرآن میں 'صلوۃ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ صلوۃ کا لفظ قرآن کی ایک اصطلاح ہے۔ صلوۃ سے مراد وہ مخصوص عبادت ہے جو اسلام میں اہلِ ایمان کے لیے مقرر کی گئی ہے (4:103)۔ صلوۃ کا یہ مفہوم تاریخی تواتر سے غیر مشتبہ طور پر اب ایک معلوم واقعہ بن چکا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ صلوۃ کو اس کے اصطلاحی معنی میں بطور عبادت نہیں لے گا، بلکہ وہ صلوۃ کو اس کے لغوی معنی کے اعتبار سے لے گا، یعنی اِس معنی میں کہ صلوۃ سے مراد مخصوص عبادت نہیں، بلکہ صلوۃ کا مطلب ہے: اتباعِ دین، تو قرآن کے لفظ کی ایسی تفسیر بلاشبہہ ناقابل قبول ہوگی۔ علمی اصولوں کے اعتبار سے، اُس کا کوئی وزن نہ ہوگا۔

اِسی طرح مثال کے طور پر قرآن میں 'حج' کا لفظ معروف سالانہ عبادت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ رسول اور اصحاب رسول کے زمانے سے لے کر اب تک علمی اور تاریخی تواتر کے اعتبار سے حج کے اِس مفہوم میں کوئی شک نہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ کرے کہ وہ حج کو اس کے معروف اصطلاحی معنی سے ہٹا کر اس کے لغوی معنی میں لے اور یہ دعوی کرے کہ حج کا مطلب حجت کرنا ہے، یعنی دلائل کے ساتھ امت کے مسائل پر باہم ڈسکشن کرنا۔ اِس قسم کی تفسیر بلاشبہہ قابلِ رد ہوگی، کیوں کہ وہ مسلّمہ علمی اصولوں کے خلاف ہے۔

اِسی طرح 'صوم' کی مثال لیجئے۔ صوم عربی زبان کا ایک لفظ ہے۔ ابتدائی معنی کے اعتبار سے، صوم کا مطلب رکنا (abstinence) ہے۔ اسلام میں جب رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنا فرض کیا گیا تو روزے کے لیے ایک اصطلاحی لفظ وضع کیا گیا۔ یہ اصطلاحی لفظ صوم تھا۔ صوم کا لفظ اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے اِس مفہوم کے لیے ایک قریب تر لفظ تھا۔ ابتدائی معنی کے لحاظ سے صوم کا لفظ صرف رکنا تھا، لیکن جب صوم کو بطور اصطلاح استعمال کیا گیا تو اس کے معنی یہ ہو گئے کہ رمضان کے مہینے میں دن کے اوقات (from dawn to dusk) میں کھانے پینے جیسی چیزوں سے رکے رہنا۔ اب اسلام میں صوم کا لفظ ایک متعین عبادتی اصطلاح کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

رسول اور اصحاب رسول کے زمانے سے لے کر اب تک اہلِ اسلام کے درمیان نسل در نسل صوم کا

لفظ اپنے اِسی اصطلاحی مفہوم میں رائج رہا۔ اسلام کے متعلق ہزاروں کتابوں میں صوم کا لفظ اِسی اصطلاحی معنی میں استعمال کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ صوم کا لفظ اپنے عبادتی اصطلاح کے مفہوم میں ایک معلوم اور مسلّم لفظ بن گیا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کرے کہ چودہ سو سالہ تاریخی تسلسل کو نظر انداز کر کے وہ صرف لغت کے ذریعے صوم کے لفظ کا معنی متعین کرے تو یہ بلاشبہہ ایک نا قابلِ تسلیم فعل ہوگا۔ علم کے تمام معروف طریقے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔

زبان کا تلفظ اور اس کا مفہوم

زبان خواہ کوئی بھی ہو، اس کے کسی لفظ کا تلفظ (pronunciation) اور اس کا مفہوم (meaning) دونوں سماعی ہیں، نہ کہ قیاسی، یعنی اہلِ زبان کے درمیان لمبی مدت تک زبان کے الفاظ اپنے تلفظ اور اپنے مفہوم دونوں کے اعتبار سے استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ اِس طرح نسل در نسل استعمال کے تسلسل سے زبان کے الفاظ کا تلفظ اور ان کا مفہوم دونوں غیر مشتبہ طور پر متعین ہو جاتے ہیں۔ الفاظ کا یہ تلفظ اور ان کا یہ مفہوم کسی عقلی منطق پر قائم نہیں ہوتا، بلکہ وہ تمام تر اہلِ زبان کے درمیان استعمال کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر انگریزی زبان میں مچھلی کو فش (fish) کہا جاتا ہے۔ اِس لفظ کا یہ تلفظ اہلِ زبان کے درمیان صدیوں کے استعمال کے نتیجے میں پوری طرح معلوم اور متعین ہو گیا ہے۔ لیکن برٹش رائٹر برنارڈ شاہ (وفات: 1950) نے کہا کہ میں فش کا تلفظ گھوٹی (ghoti) کروں گا۔ اس کی منطق یہ تھی کہ انگریزی زبان میں کبھی ایف (F) کا حرف جی (G) کی آواز دیتا ہے۔ اِسی طرح آئی (I) کا حرف کبھی او (O) کی آواز دیتا ہے۔ اسی طرح ایس ایچ (Sh) کبھی ٹی (T) کی آواز دیتا ہے۔ مگر اہلِ زبان نے برنارڈ شا (Bernard Shaw) کی اِس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ انھوں نے برنارڈ شا کی بات کو صرف ایک جوک (joke) کہہ کر نظر انداز کر دیا۔

اِسی طرح مہاتما گاندھی (وفات: 1948) نے ہندو دھرم کی مقدس کتاب بھاگود گیتا (Bhagwad Gita) کی شرح لکھی۔ اِس میں انھوں نے بتایا کہ بھاگود گیتا میں مہابھارت کا جو قصہ

ہے، وہ خارجی معنوں میں کسی حقیقی جنگ کا قصہ نہیں ہے، بلکہ وہ داخلی معنوں میں ایک روحانی جنگ (spiritual war) کا قصہ ہے۔ لیکن جیسا کہ معلوم ہے، کسی ہندو اسکالر نے اِس شرح کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ اس کو مہاتما گاندھی کا صرف ایک ذاتی خیال کہہ کر نظر انداز کر دیا۔

یہی معاملہ قرآن کا ہے۔ قرآن کی زبان عربی ہے۔ قرآن ساتویں صدی عیسوی میں عرب میں اترا۔ رسول اور اصحابِ رسول کی کوشش سے پورے عرب نے قرآن کے دین کو قبول کرلیا۔ اِس کے بعد مسلسل دعوت وتبلیغ کی کوشش جاری رہی، یہاں تک کہ ایشیا اور افریقہ کے درمیان وہ وسیع خطہ وجود میں آیا جس کو عرب دنیا (Arab World) کہا جاتا ہے۔

عرب دنیا میں عمومی طور پر اور عرب دنیا کے باہر خصوصی طور پر، قرآن اپنی عربی زبان میں پڑھا جانے لگا۔ لوگوں نے قرآن کو حفظ کیا، قرآن کی ڈکشنریاں تیار کیں، قرآن کی تفسیریں لکھیں، قرآن سے متعلق علوم پر بے شمار کتابیں عربی زبان میں تیار کیگئیں، یہاں تک قرآن پر مبنی عربی کتابوں کا ایک وسیع اسلامی کتب خانہ وجود میں آ گیا۔ عربی زبان کا یہ استعمال اور اہلِ زبان کے درمیان اس کا چرچا ایک تاریخی عمل تھا جو کہ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت تک جاری رہا۔

اب یہ تاریخ اکیسویں صدی میں پہنچ چکی ہے۔ زبان کے تمام معلوم قوانین کے مطابق، اب قرآن میں استعمال ہونے والے عربی الفاظ ہر اعتبار سے معلوم اور محقّق (established) ہو چکے ہیں، الفاظ کے تلفظ کے اعتبار سے بھی اور اس کے معنی کے اعتبار سے بھی۔ اب اگر کوئی شخص قرآن میں استعمال ہونے والی زبان کو اس کے معروف معنی سے ہٹا کر کسی نئے معنی میں استعمال کرے تو اس کا یہ فعل بلاشبہہ ایک مضحکہ خیز (ridiculous) فعل ہوگا۔ وہ ہرگز اِس قابل نہیں ہوگا کہ اس پر کوئی سنجیدہ توجہ دی جائے۔

مثلاً قرآن میں ایمان اور اسلام کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اہلِ زبان کے درمیان ایمان واسلام کا دینی مفہوم غیر مشتبہ طور پر معلوم اور متعین ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایمان واسلام کے مذہبی اطلاق (religious connotation) کا انکار کرے اور کہے کہ ایمان واسلام کا مطلب امن (peace)

ہے، اور وہ یہ دعوی کرے کہ ایمان واسلام دراصل امن کے معنی میں ہے اور اس کا مقصود یہ ہے کہ دنیا میں پرامن سماج (peaceful society) قائم کی جائے تو اس کو ایک غیر سنجیدہ خیال کہہ کر رد کردیا جائے گا۔ اسلام بلاشبہہ امن (peace) چاہتا ہے، لیکن ایمان واسلام کے الفاظ کی حیثیت خالص دینی اصطلاح کی ہے۔

ان اصطلاحوں کے مفہوم کو مذکورہ انداز میں بدلنا ایمان واسلام کے سیکولرائزیشن کے ہم معنی ہوگا جو بداہۃً ہی قابلِ رد ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ رب کا مطلب ربوبیت کا نظام یا سوشلسٹ سسٹم (socialist system) ہے تو اِس قسم کی بات کو ہرگز سنجیدہ طور پر نہیں لیا جاسکتا۔ کیوں کہ رب کا مفہوم زبان کے استعمال کی طویل تاریخ کے نتیجے میں حتمی طور پر معلوم اور متعین ہو چکا ہے۔

لفظ اور معنی کا تواتر

ہر لفظ کا ایک مفہوم ہوتا ہے۔ یہ مفہوم لفظ کے ساتھ اس کے لاینفک جُز (inseparable part) کے طور پر شامل رہتا ہے۔ جس طرح لفظ تاریخ میں سفر کرتا ہے، اُسی طرح اس کا مفہوم بھی ساتھ ساتھ سفر کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان ہر دور کے لوگوں کے لیے باہم قابلِ فہم وسیلہ (mutually understandable means) بنی رہتی ہے۔ اگر لفظ اور معنی کے درمیان خلا (gap) واقع ہوجائے تو انسانوں کے درمیان بامعنی تبادلہ خیال (meaningful exchange) ختم ہوجائے گا اور انسانی بستیاں عملاً گونگے لوگوں کی بستیاں بن جائیں گی۔

اِس معاملے کو عام طور پر اہلِ علم نے بیان کیا ہے۔ چناں چہ شاہ اسماعیل شہید دہلوی اپنی کتاب ''عبقات'' میں اِس نقطہ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لا یخفی علی من له أدنی ممارسة بأسالیب الکلام أن هذا القول ناش عن جهل متراکم، إذ وضع الألفاظ لمعانیها من المتواترات (عبقات: 5، بحوالہ ''میزان''، جاوید احمد غامدی، صفحہ: 33) یعنی اسالیبِ کلام پر جس شخص کو کچھ بھی ممارست حاصل ہے، اُس سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ یہ نقطہ نظر (کہ لفظ اپنے معنی کے ساتھ متواتر نہیں ہوتا)

سرتاسر جہالت ہے۔اِس لیے کہ لفظ کا اپنے معنی کے لیے وضع ہونا ایک ایسا عمل ہے جو تواتر پر مبنی ہے۔

اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔عربی زبان کا ایک لفظ 'أخ' ہے۔یہ لفظ اپنے ابتدائی لغوی مفہوم کے لحاظ سے، سگے بھائی (blood brother) کے لئے استعمال ہوتا ہے، مگر اِسی کے ساتھ اِس کا ایک استعاراتی مفہوم (metaphorical meaning) بھی ہے، یعنی کسی کو غیر خونی رشتے کے باوجود اظہارِ تعلق کے لیے بھائی کہنا۔'أخ' کا یہ استعاراتی مفہوم بھی قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے اور اب تک مسلسل طور پر وہ اُسی طرح لوگوں کے درمیان بولا اور سمجھا جاتا ہے۔

عرب میں ظہور اسلام سے قبل کا جو زمانہ تھا، اس کو جاہلیت کا زمانہ کہا جاتا ہے، یعنی حقیقت سے بے خبری کا زمانہ۔ابوتمام الطائی (وفات: 231ھ) نے قدیم دور کے عرب شعرا کے کلام کا ایک منتخب مجموعہ تیار کیا تھا جو بعد کو "دیوان الحماسة" کے نام سے شائع ہوا۔اِس مجموعے میں جاہلی دور کے ایک تغلبی شاعر عمیر بن شُییم بن عمرو القطامی (وفات: 130ھ) کے کچھ اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ان میں سے ایک شعر یہ ہے:

وأحيانا على بكر أخينا إذا مالم نجد إلا أخانا

(اور کبھی ہم اپنے بھائی بنو بکر سے لڑ جاتے ہیں۔جب ہم اپنے بھائی کے سوا کسی اور کو نہیں پاتے)

عرب شاعر کے اِس شعر میں 'أخ' کا لفظ اپنے ابتدائی مفہوم میں نہیں ہے، یعنی وہ سگے بھائیوں کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے۔اِس شعر میں یہ لفظ اپنے استعاراتی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔شاعر نے جب یہ لفظ اپنے شعر میں اس کے استعاراتی مفہوم میں استعمال کیا، اُس وقت یہ لفظ اپنے اِس مفہوم کے لحاظ سے ایک معروف لفظ بن چکا تھا، اِس لیے کسی کو اس کے سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آئی۔

پھر ہجرت نبوی (622ء) کے بعد قرآن میں انصار و مہاجرین کے بارے میں یہ آیت اتری: وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (3:103)۔قرآن کی اِس آیت میں "اخوان" (بھائی) کا لفظ اپنے ابتدائی لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ اپنے استعاراتی معنی میں ہے۔چوں کہ یہ لفظ اپنے اِس استعاراتی مفہوم میں نسل در نسل

استعمال کی بنا پر لوگوں کے لیے پوری طرح قابل فہم بنا ہوا تھا، اِس لیے جب یہ آیت اتری تو لوگوں نے بلا اشتباہ اِس لفظ کو اس کے استعاراتی معنی میں لیا، نہ کہ اس کے ابتدائی لغوی معنی میں۔

اِسی طرح 1928 میں شیخ حسن البنا کی قیادت میں مصر میں عربوں کی ایک تنظیم بنی۔ اِس کا نام "الإخوان المسلمون" رکھا گیا۔ تنظیم کے اِس نام میں "الإخوان" کا لفظ اپنے ابتدائی لغوی معنی میں نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے استعاراتی معنی میں ہے، یعنی سگے بھائیوں کے معنی میں نہیں، بلکہ اسلامی بھائیوں کے معنی میں۔ اب اگر کوئی شخص یہ کرے کہ وہ الاخوان المسلمون کے نام کو اس کے ابتدائی لغوی معنی میں لے اور یہ کہے کہ یہ سگے بھائیوں (blood brothers) کی ایک تنظیم ہے، تو اس کی یہ بات بلاشبہہ ایک غیر علمی بات ہوگئی۔ کوئی بھی ذی علم آدمی اس کو اہمیت نہیں دے گا اور نہ وہ اِس کی ضرورت سمجھے گا کہ اس کا جواب دیا جائے — یہی معاملہ تمام مستعمل عربی الفاظ کا ہے۔

قولِ بلیغ میں کلام

قرآن میں اسلوبِ دعوت کو بتاتے ہوئے ہوئے یہ آیت آئی ہے: وَقُل لَّهُمْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيغًا (4:63) یعنی تم اُن سے ایسی بات کہو جو اُن کے دلوں میں اترنے والی ہو:

And speak to them in such terms as will address their minds.

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے پیغام کو اِس طرح پہنچانا مطلوب ہے کہ وہ لوگوں کے ذہن کو ایڈریس کرے۔ قرآن کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قولِ بلیغ کے اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اللہ نے قرآن کو عربی مبین (26:195) کی زبان میں اتارا۔ عربی مبین کی زبان کیا ہے، یہ وہی چیز ہے جس کو وضوح (clarity) کہا جاتا ہے، یعنی ایسی زبان میں جس کے اندر کامل وضوح ہو اور اِس بنا پر وہ لوگوں کے لیے پوری طرح قابلِ فہم ہو۔

کوئی زبان سننے یا پڑھنے والوں کے لیے قابلِ فہم کس طرح بنتی ہے۔ ایسا لمبی مدت کے بعد ہوتا ہے۔ کوئی زبان اچانک نہیں بنتی۔ زبان ہمیشہ دھیرے دھیرے وجود میں آتی ہے۔ بہت سے لوگ

لمبی مدت تک اس کو لکھتے اور بولتے رہتے ہیں۔ اِس طرح زبان میں ایک معنوی تسلسل قائم ہوجاتا ہے۔ یہی معنوی تسلسل وہ چیز ہے جو لوگوں کے لیے کسی زبان کو قابلِ فہم بناتا ہے۔ مثلاً قدیم دور کی کچھ زبانیں اب عملاً معدوم (instinct) ہوگئی ہیں۔ لکھنے اور بولنے والوں کے درمیان اِن زبانوں کا تسلسل باقی نہیں رہا۔ اِس بنا پر اِن زبانوں میں وضوح کی صفت موجود نہیں۔ کھدائی (excavation) کے دوران اِن قدیم زبانوں کے کچھ کتبے (slabs) دریافت ہوئے ہیں، مگر اِن کتبوں پر لکھی ہوئی قدیم زبانیں آج کے انسان کے لیے قابل فہم نہیں۔ قدیم زبانوں کے صرف کچھ ماہرین (experts) ہیں جو اِن کتبوں کو پڑھ کر اس کا مطلب بتاتے ہیں۔

مثال کے طور پر قرآن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کا ایک واقعہ اِن الفاظ میں بیان ہوا ہے: وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَى أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ (5:83) یعنی جب وہ اُس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اِس سبب سے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا۔

قرآن کو سن کر مذکورہ افراد پر یہ غیر معمولی تاثر اِس لیے ہوا کہ وہ ایک ایسی زبان میں تھا جو اُن کے لیے پوری طرح معلوم زبان تھی۔ پیدا ہونے کے بعد سے مسلسل طور پر وہ اِس زبان کو سنتے چلے آرہے تھے۔ اِس بنا پر اِس زبان میں کہی ہوئی بات اُن کے لیے پوری طرح ایک واضح کلام کی حیثیت رکھتی تھی۔ اگر زبان میں وضوح کی صفت موجود نہ ہوتی تو اس کو سننا اُن کو غیر معمولی طور پر متاثر بھی نہیں کرسکتا تھا۔

زبان میں معنوی تسلسل کا یہ معاملہ اتنا زیادہ اہم ہے کہ کسی بھی عذر کی بنا پر اس میں تبدیلی کو قبول نہیں کیا جاتا، کیوں کہ ہر تبدیلی وضوح کو متاثر کرے گی۔ زبان کے الفاظ میں ان کے معانی کا تسلسل اتنا ہی زیادہ اہم ہے جتنا کہ خود زبان اہم ہے۔ زبانوں کے الفاظ کا تلفظ اگر محفوظ نہ رہے تو ان الفاظ کی درست ادائیگی ممکن نہ ہوگی۔ اِسی طرح زبانوں کے الفاظ کا معنوی تسلسل اگر باقی نہ رہے تو زبان ایک قابلِ فہم زبان کی حیثیت سے اپنا وجود ختم کردے گی۔

مثال کے طور پر تمام زبانوں میں کیفیت کو دل سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مثلاً انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ — دل کی پوری آمادگی کے ساتھ (wholeheartedly)۔ موجودہ زمانے میں سائنس کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہر قسم کی کیفیات کا مرکز دماغ (mind) ہے۔ دل کا تعلق صرف گردشِ خون (circulation of blood) سے ہے۔

اِس تحقیق کے باوجود زبان میں یہ تبدیلی نہیں کی گئی کہ 'ہول ہارٹڈلی' کے بجائے ہول مائنڈڈلی (wholemindedly) کہا جانے لگے۔ کیوں کہ اِس سے زبان کا معنوی تسلسل متاثر ہو رہا تھا اور زبان کے معنوی تسلسل کے متاثر ہونے کا مطلب یہ تھا کہ لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے زبان کے وضوح کی صفت باقی نہ رہے۔ اِس لیے معنوی تسلسل کے پہلو کی رعایت کی گئی اور زبان کے استعمال کے اعتبار سے اس کو باقی رکھا گیا۔ حالاں کہ علمِ تشریح الاعضا (anatomy) میں اب دل (heart) کا مطالعہ صرف اِس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ وہ گردشِ خون کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔

اِسی طرح دنیا کی تمام زبانوں میں چاند کی روشنی (moonlight) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، حالاں کہ جدید فلکیات کے مطالعے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ چاند میں اپنی کوئی روشنی نہیں۔ رات کے وقت چاند کے اوپر جو روشنی دکھائی دیتی ہے، وہ دراصل چاند کی سطح پر سورج کی روشنی کے انعکاس (reflection) کی بنا پر ہے۔ اس دریافت کے باوجود تمام زبانوں میں اب بھی چاند کی روشنی (moonlight) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ اِس تحقیق کے بعد اِس ظاہرے کے لیے 'مون لائٹ' کے لفظ کو متروک قرار دے دیا جائے اور اس کی جگہ اس کو سن لائٹ ریفلیکٹڈ بائی مون (sunlight reflected by moon) کہا جانے لگے۔ ایسا اِس لیے ہوا کہ اِس معاملے میں لفظ کو بدلنا صرف اِس قیمت پر ہوتا کہ لفظ کا معنوی تسلسل ٹوٹ جائے اور زبان میں وضوح کی صفت باقی نہ رہے۔

یہی معاملہ قرآن کا بھی ہے جو عربی مبین کی زبان میں اترا ہے۔ عربی زبان بھی اُسی طرح لفظی اور معنوی تسلسل کے ذریعے بنی ہے جس طرح دوسری زبانیں بنی ہیں۔ انسانوں کی ایک بڑی جماعت

لمبی مدت تک عربی زبان بولتی اور لکھتی رہی۔ اِس طرح لوگوں کے اندر نسل در نسل یہ لسانی عمل جاری رہا، یہاں تک کہ لفظی اور معنوی تسلسل کے نتیجے میں عربی زبان آخری حد تک ایک معلوم اور متعین زبان بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں جب قرآن عربی زبان میں اترا تو فوراً ہی اس نے سننے والوں کے ذہن کو ایڈریس کیا۔ انسانوں کی بڑی تعداد نہ صرف قرآن پر ایمان لائی، بلکہ اس نے عربی زبان بھی سیکھی، تاکہ وہ قرآن کو اس کی اصل زبان میں سمجھ سکے۔

اسلام سے پہلے عربی زبان عرب میں موجود تھی، لیکن اُس وقت وہ زیادہ تر ایک قبائلی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ جلد ہی اِن تمام قبائل نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد انھوں نے بڑے پیمانے پر عربی زبان کی خدمت کی۔ انھوں نے عربی زبان کے لغات تیار کیے، انھوں نے عربی زبان کو بول چال کے دائرے سے نکال کر لکھنے کی زبان بنا دیا۔ انھوں نے قرآن کے استعمالات اور قرآن کی اصطلاحات کو پوری طرح اخذ کیا۔ اُن پر کتابیں تیار کیں۔ اِس طرح زمین کے بڑے رقبے میں قرآن اور اس کی زبان کا چرچا وسیع پیمانے پر جاری ہوگیا۔ یہ عمل ہزار سال سے زیادہ مدت تک جاری رہا، یہاں تک کہ قرآن کا ہر بیان پوری طرح ایک ثابت شدہ بیان بن گیا۔ قرآن کی زبان، قرآن کے استعمالات، قرآن کی اصلاحیں کروڑوں لوگوں کے درمیان غیر مشتبہ طور پر مسلمہ حقیقت قرار پا گئیں۔

اب ہزار سال سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد جو لوگ قرآن کی زبان، اس کے استعمالات اور اس کی اصطلاحات کو دوبارہ نیا مفہوم دینا چاہیں، تو یہ بلاشبہہ ناقابلِ قبول ہوگا۔ یہ ایک ایسا فعل ہوگا جس کا جواز نہ اسلام میں ہے اور نہ علم میں ہے اور نہ لسانیات میں۔ وہ صرف اِس قابل ہے کہ اس کو بے اصل قرار دے کر مکمل طور پر رد کر دیا جائے۔

غیر علمی طریقِ مطالعہ

جن لوگوں نے قرآن فہمی کے بارے میں مذکورہ موقف اختیار کیا ہے، وہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس موقف کا تعلق براہِ راست طور پر لسانیات (linguistics) سے ہے۔ یہ موقف اپنے وسیع پہلو (extended implication) کے اعتبار سے، اِس معاملے میں عالمی طور پر مسلّمہ اصول

(universally accepted norm) سے ٹکراتا ہے۔ وہ علمی مطالعہ (scientific study) کے معروف طریقے کی نفی کے ہم معنی ہے۔

مطالعہ (study) انسانی سرگرمیوں میں سے ایک نہایت اہم سرگرمی ہے، مگر مطالعہ کسی ذہنی انارکی (intellectual anarchy) کا نام نہیں، بلکہ مطالعہ حقیقی معنوں میں وہ ہے جس میں انسانی ذہن کا منظم استعمال (disciplined exercise) کیا جائے۔ علمی مطالعے کا ایک معلوم اور ثابت شدہ فریم ورک ہے۔ جو مطالعہ اِس فریم ورک کی پابندی کے ساتھ کیا جائے، وہ مطالعہ ہے اور جس مطالعے میں اِس تسلیم شدہ فریم ورک کو نظر انداز کر دیا جائے، وہ مطالعہ نہیں ہے، بلکہ یقینی طور پر وہ ایک ایسی غیر علمی روش ہے جس کو ذہنی انارکی کے سوا کسی اور لفظ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

علمی مطالعہ ہمیشہ سے ایک سنجیدہ عمل سمجھا جاتا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اب مطالعے کا علم (science of study) ایک مستقل موضوع بن چکا ہے۔ اِس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ اِس موضوع کو علمیات یا نظریۃ المعرفہ (epistemology) کہا جاتا ہے۔

قرآن مذہبیات (الٰہیات) کے موضوع پر ایک معروف کتاب ہے۔ مطالعہ کتب کا جو طریقہ دوسری کتابوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، عین وہی طریقہ یقینی طور پر قرآن کے مطالعے کے لیے بھی استعمال کیا جائے گا۔ جو لوگ اِس مسلّمہ طریقے کو چھوڑ کر بطور خود کوئی دوسرا طریقہ اختیار کریں تو یہ طریقہ اہلِ علم کے درمیان کبھی قبولیت کا درجہ نہیں پا سکتا۔ اِس معاملے میں کوئی خود ساختہ طریقِ مطالعہ (self-invented method of study) ہرگز قابلِ قبول نہیں۔

اہلِ قرآن کا کیس

یہ چند مثالیں ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو ''اہلِ قرآن'' کہا جاتا ہے، ان کا کیس علمی اعتبار سے کتنا زیادہ بے بنیاد (baseless) ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم قرآن کو مانیں گے، لیکن ہم قرآن کا مفہوم صرف ڈکشنری کے ذریعے طے کریں گے، نہ کہ اُس تشریح کے ذریعے جو

اہلِ اسلام کے درمیان رسول اور اصحاب رسول کے زمانے سے لے کر اب تک تواتر کی بنا پر رائج ہیں۔ اِس قسم کی بات بلاشبہہ آخری حد تک غیر علمی ہے۔ یہ اصول نہ صرف قرآن کو سمجھنے میں مانع ہے، بلکہ وہ دنیا کی کسی بھی کتاب کو سمجھنے کے لیے یقینی طور پر مانع کی حیثیت رکھتا ہے۔

مثال کے طور پر ہر ملک میں اساسی قانون کی ایک تحریری دستاویز ہوتی ہے جس کو کانسٹی ٹیوشن (constitution) کہا جاتا ہے۔ کانسٹی ٹیوشن کی یہ اصطلاح ایک معروف اصطلاح ہے جس کو ساری دنیا میں اس کے اصطلاحی معنی کے اعتبار سے تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن جہاں تک لغوی مفہوم کا تعلق ہے، کانسٹی ٹیوشن کے معنی ساخت (structure) کے ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص کانسٹی ٹیوشن کے لغوی مفہوم کو لے لے اور اس کی روشنی میں وہ مختلف ملکوں کے آئینی دستاویزات کا مفہوم متعین کرے تو یقینی طور پر وہ غلطی کرے گا اور اس کی تشریحات بلاشبہہ قابل رد قرار پائیں گی۔

کسی کتاب کے مطالعے کے لیے یہی واحد درست طریقِ مطالعہ ہے۔ جو لوگ اِس طریقِ مطالعہ کو نہ مانیں، وہ دوسری کتابوں کو سمجھنے سے بھی قاصر رہیں گے اور ایسے لوگ قرآن کو سمجھنے سے بھی یقینی طور پر محروم ہو جائیں گے۔ ایسے لوگوں کا کیس علمی مطالعے کا کیس نہیں ہے، بلکہ وہ صرف فکری بھٹکاؤ کا کیس ہے۔ اِس کی کوئی اہمیت نہ علمی اعتبار سے ہوگی اور نہ اسلامی اعتبار سے۔

قرآن یا انکارِ قرآن

ایسی حالت میں کچھ لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم قرآن کو صرف قرآن کے ذریعے سمجھیں گے، حدیث اور تاریخ اور دورِ اول کے علما کی تشریحات کو الگ کر کے ہم قرآن کا مطالعہ کریں گے۔ اِسی طرح ان کا یہ کہنا کہ قرآن میں آئے ہوئے جن الفاظ کو اصطلاح (terms) کے مفہوم میں لیا جانے لگا ہے، وہ سب قرآن کو سمجھنے میں رکاوٹ ہیں۔ مثلاً صلوۃ، صوم، زکوۃ اور حج، وغیرہ۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہم قرآن کے الفاظ کو ان کے اصطلاحی معنوں میں نہیں، بلکہ ان کے لغوی معنی کے اعتبار سے لیں گے اور خالص لغوی انداز میں ان کا مفہوم متعین کریں گے۔

یہ نظریہ آخری حد تک غیر علمی نظریہ ہے۔ اِس قسم کے نظریے کو لے کر دنیا کی کوئی کتاب سمجھی نہیں

جاسکتی۔ اسکالرشپ کا کوئی بھی اصول اس نظریے کی حمایت نہیں کرتا۔ یہ نظریہ صرف کچھ ایسے لوگوں کی ذہنی پیداوار ہے جو غالباً نہ علم کے حدود کو سمجھتے اور نہ وہ لسانیات (linguistics) کے اصول سے کوئی واقفیت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کا فریم ورک بھی وہی ہے جو دوسری علمی کتابوں کو سمجھنے کے لئے مسلّمہ طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اہلِ قرآن کا جو موقف ہے، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مکمل طور پر ایک غیر علمی موقف ہے، نہ کہ کوئی علمی موقف۔ مسلّمہ علمی اصولوں میں سے کوئی بھی اصول اس نقطہ نظر کی حمایت نہیں کرتا۔ اِس قسم کی انفرادیت علم کے میدان میں بلاشبہہ قابل رد ہے۔

اللہ اور رسول کی اطاعت

قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر بار بار حکم دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اِس سلسلے میں ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ (4:59)۔

اِس طرح کی آیتوں سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اطاعت کے معاملے میں اللہ اور رسول کے درمیان تفریق جائز نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اصلاً جو چیز مطلوب ہے، وہ اللہ کی اطاعت ہے، لیکن یہ ایک عملی حقیقت ہے کہ خود اللہ کی اطاعت کی درست ادائیگی کے لیے رسول کی اطاعت لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن کی ایک آیت میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (4:64) یعنی ہم نے جو بھی رسول بھیجا ہے، اِسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اِسی طرح قرآن میں ارشاد ہوا ہے: مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (4:80) یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

یہی بات ایک روایت میں بیان کی گئی ہے۔ اِس سلسلے میں روایت کے الفاظ یہ ہیں: لا ألفين أحدكم متكأ على أريكته، يأتيه الأمر من أمري مما أمرتُ به أو نهيت عنه، فيقول لا ندري، ما وجدنا في كتاب الله اتبعناه (سنن الترمذي، رقم الحديث: 2663) یعنی تم

میں سے کوئی شخص ایسا نہ کرے کہ وہ اپنی مسند پر ٹیک لگائے ہوئے ہو، اس کے پاس میرے حکموں میں سے کوئی حکم آئے جس میں میں نے کسی بات کو کرنے کا حکم دیا ہو اور کسی بات سے منع کیا ہو، پھر وہ کہے کہ ہم نہیں جانتے، ہم نے اللہ کی کتاب میں جو پایا، اس کی ہم نے پیروی کی۔

قرآن کی مذکورہ آیت اور اِس حدیث رسول میں جو بات کہی گئی ہے، وہ نہایت سنگین بات ہے۔ یہ مستقبل کے اُس فتنے کی طرف اشارہ ہے جب کہ امت میں ایسے افراد پیدا ہوں گے جو یہ کہیں گے کہ ہم قرآن کو مانتے ہیں، لیکن ہم حدیث رسول کو نہیں مانتے۔ اِس سے مراد واضح طور پر وہی لوگ ہیں جن کو موجودہ زمانے میں منکرین حدیث یا اہلِ قرآن کہا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ دین اگر صرف انفرادی دین کا نام ہو تو دین کو عملاً ترک کرنے کے بعد بھی آدمی اپنے اِس ترک کو چھپا سکتا ہے۔ وہ لوگوں کو یہ تاثر دے سکتا ہے کہ وہ دین پر قائم ہے۔ لیکن جب دین ایک انسٹی ٹیوشنلائزڈ دین (institutionalized religion) بن جائے تو اِس قسم کی پوزیشن اختیار کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اب دین کا ایک باقاعدہ اجتماعی فارم بننے کی وجہ سے ایسا ہوجاتا ہے کہ اگر کوئی شخص دینی نظام کا حصہ ہے تب بھی لوگ اُس کو جان لیتے ہیں اور اگر وہ دینی نظام کا حصہ نہیں ہے تب بھی لوگ اُس سے باخبر ہوجاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کا انسٹی ٹیوشنلائزیشن اِس امر میں مانع ہے کہ کوئی شخص دین سے کٹ جائے، اس کے باوجود وہ انسٹی ٹیوشنلائزڈ دین یا بالفاظ دیگر مسلم معاشرے کا مقبول حصہ بنا رہے اور اس کے معاشرتی فوائد (social interest) میں کوئی فرق واقع نہ ہو۔ یہ شعوری یا غیر شعوری طور پر عملاً وہی پالیسی ہے جس کو کوراَپ (cover-up) پالیسی کہا جاتا ہے، جو حدیث کے انکار کے نام پر عملاً خود دین کے انکار کے ہم معنی ہے۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم قرآن کو مانیں گے، لیکن ہم حدیث کو نہیں مانیں گے، وہ دراصل یہ چاہتے ہیں کہ وہ دین کی ذمے داریوں سے جدا بھی ہوجائیں اور اسی کے ساتھ وہ مسلم معاشرے کا حصہ بھی بنے رہیں، تاکہ ان کے دنیوی مفادات (worldly benefits) بدستور محفوظ رہیں۔

مگر یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس طرح کی روش اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک بلا اعلان ارتداد (undeclared apostasy) یا جائز کردہ ارتداد (justified apostasy) ہے۔ جو لوگ ایسی روش اختیار کریں، وہ بلاشبہہ ایک سنگین رسک (risk) لے رہے ہیں۔ ان کے لیے شدید طور پر یہ خطرہ ہے کہ ان کا کیس دنیا میں برہان سے محرومی کا کیس بن جائے اور آخرت میں اللہ کی ابدی رحمت سے محرومی کا کیس۔

اسلام ایک محفوظ دین

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ (15:9) یعنی بے شک ہم نے الذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اِسی طرح قرآن کی ایک آیت یہ ہے: لَا یَاۡتِیۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَیۡنِ یَدَیۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ ؕ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ حَکِیۡمٍ حَمِیۡدٍ (41:42) یعنی اِس میں نہ باطل اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ حکیم اور حمید کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

اِن آیتوں میں جس حفاظت کا ذکر ہے، اُس سے مراد براہِ راست طور پر قرآن ہے، لیکن بالواسطہ طور پر اُس سے مراد وہ پورا دینِ اسلام ہے جس پر اللہ نے اپنی رضامندی (5:3) کا اعلان کیا ہے۔ یہ محفوظ دین دنیا میں لوگوں کے لیے ہدایتِ الٰہی کا مستند ماخذ ہے اور آخرت کے اعتبار سے وہ لوگوں کے اوپر اللہ کی حجت ہے۔

اب یہ سوال ہے کہ یہ دین کس طرح ایک محفوظ دین بنا۔ یہ واقعہ معجزاتی طور پر نہیں ہوا، بلکہ وہ اسباب کے دائرے میں اُسی طرح وقوع میں آیا جس طرح اس عالمِ اسباب میں دوسری تمام باتیں وقوع میں آتی ہیں۔ اِس معاملے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے حفاظتِ دین کے اِس کام کو اسباب کے دائرے میں انجام دیا، اور اس کی عملی صورت یہ تھی کہ اللہ نے اسلام کو ایک انسٹی ٹیوشنلائزڈ دین (institutionalized religion) کی حیثیت دے دی۔ اِس سے پہلے دینِ اسلام کی حیثیت صرف ایک نظری صداقت کی تھی، لیکن انسٹی ٹیوشنلائزیشن (institutionalization) کے بعد یہ

ہوا کہ دینِ اسلام کے ساتھ ایک مزید صفت جمع ہوگئی، یعنی اجتماعی سطح پر دینِ اسلام کو مسلسل طور پر ایک مظاہراتی (demonstrable) چیز بنا دینا۔ یہ تقریباً وہی چیز ہے جس کو تاریخی زبان میں عملی تواتر کہا جاتا ہے۔

دین کو انسٹی ٹیوشن کی صورت دینے کے لیے ایک ضروری چیز درکار تھی، اور وہ تھی اہلِ ایمان کی بڑی تعداد جو زمین کے وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی ہو۔ اِس طرح یہ ہوتا ہے کہ دینِ اسلام ہر دن لوگوں کے سامنے ایک قابلِ مشاہدہ چیز کی حیثیت سے مسلسل طور پر آتا رہتا ہے، یہاں تک کہ دین کی عملی صورت بھی اُسی طرح ثابت شدہ بن جاتی ہے جس طرح اس کی نظری صورت ہے۔ دین کی نظری صورت کتابوں میں محفوظ ہے اور دین کا فارم عملی تواتر یا انسٹی ٹیوشنلائزڈ دین کی صورت میں لوگوں کے لیے قابلِ مشاہدہ بنا ہوا ہے۔

دینِ اسلام کو ایک باقاعدہ انسٹی ٹیوشن کی صورت دینا اِس لیے ممکن ہوا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ماس کنورزن (mass conversion) ہوا، لوگوں کی بڑی تعداد اسلام قبول کرکے دین اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئی۔ اِس طرح زمین کے بڑے رقبے میں مسلسل طور پر یہ اجتماعی واقعہ پیش آنے لگا کہ لوگ مختلف صورتوں میں قرآن کو یکساں طور پر پڑھ رہے ہیں، بے شمار مسجدوں میں بیک وقت ایک ہی پیٹرن پر اذان کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں اور ایک ہی پیٹرن پر مسلسل اجتماعی صورت میں نمازیں ادا کی جارہی ہیں، ایک مقرر مہینہ (رمضان) میں ہر جگہ لوگ ایک ہی انداز میں روزے رکھ رہے ہیں، ایک ہی مقرر تاریخ میں بڑی تعداد میں لوگ دنیا کے مختلف مقامات سے آکر مکہ میں اجتماعی طور پر حج کے مناسک ادا کر رہے ہیں۔ اِسی طرح بے شمار مدرسوں میں روزانہ ایک ہی نہج پر بڑی تعداد میں لوگ قرآن اور حدیث کا چرچا کر رہے ہیں، وغیرہ۔

یہی مطلب ہے دینِ اسلام کو انسٹی ٹیوشنلائزڈ دین بنانے کا۔ جب دینِ اسلام اِس طرح مسلسل طور پر ایک قابلِ مظاہرہ چیز بن جائے تو اُس وقت اس کی ہیئت ایک ایسے عملی واقعہ کی ہوجاتی ہے جس کا انکار ممکن نہ ہو۔ نظری چیزوں میں انسان کے لیے اقرار وانکار کا آپشن (option)

موجود رہتا ہے، لیکن جو نظریہ عملی صورت میں ڈھل کر قابلِ مشاہدہ بن جائے، اُس سے انکار اتنا ہی ناممکن ہوجاتا ہے جتنا کہ سورج کے نکلنے کے بعد سورج کا انکار۔

یہی وجہ ہے کہ واضعینِ حدیث نے اسلام کے اُس ثابت شدہ ورزن (established version) پر کوئی حدیث وضع نہیں کی جو کہ بڑی تعداد کے اجتماعی عمل (عملی تواتر) کے ذریعے ایک باقاعدہ انسٹی ٹیوشن کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ مثلاً کوئی موضوع حدیث ایسی نہیں ہے جو یہ بتائے کہ قرآن کی آیت الحمد للہ رب العالمین اصل میں الشکر للہ رب العالمین کے الفاظ میں اتری تھی۔ اِسی طرح کوئی موضوع حدیث اِس مفہوم کی نہیں ہے کہ سورہ الاخلاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'قل' کے بغیر صرف 'ھو اللہ أحد' کی صورت میں پڑھا، وغیرہ۔

یہی معاملہ انسٹی ٹیوشنلائزڈ دین کے دوسرے پہلوؤں کا ہے۔ مثلاً کوئی موضوع حدیث اِس مفہوم کی نہیں ہے جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ فجر کی نماز تین رکعت ہے اور مغرب کی نماز دو رکعت۔ اِسی طرح کوئی موضوع روایت ایسی نہیں ہے جو یہ بتائے کہ روزہ رکھنے کا مہینہ رمضان نہیں ہے، بلکہ رجب ہے، یا یہ کہ حج کی ادائیگی کا مہینہ ذوالحجہ نہیں ہے، بلکہ محرم ہے، وغیرہ۔ حدیث کی مستند کتابوں مثلاً موطا امام مالک اور صحیح البخاری میں جو روایتیں ہیں، عام طور پر وہ سب انسٹی ٹیوشنلائزڈ اسلام کی موافقت میں ہیں، اِس کے خلاف نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، وضعِ حدیث کا واقعہ عملاً ظہور اسلام کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد پیش آیا۔ اُس وقت تک انسٹی ٹیوشنلائزڈ اسلام اپنے تمام پہلوؤں کے اعتبار سے تشکیل پا چکا تھا۔ اُس کا ہر پہلو اجتماعی سطح پر ایک مسلّمہ واقعہ بن چکا تھا۔ اِس لیے واضعین حدیث نے جو حدیثیں وضع کیں، وہ دین کے اُس مجموعے کے بارے میں نہ تھیں جو کہ اب انسٹی ٹیوشنلائزڈ دین بن چکا تھا، بلکہ وہ اس کے دوسرے پہلوؤں کے بارے میں تھیں۔ مثلاً قرآن کے متن کے بارے میں کوئی موضوع حدیث موجود نہیں، البتہ فضائل قرآن کے باب میں موضوع روایتیں پائی جاتی ہیں۔ اِسی طرح پنج وقتہ نماز کو اِس سے کم یا زیادہ بتانے کے لیے کوئی موضوع روایت موجود نہیں، البتہ نماز کے

فضائل کے بارے میں موضوع روایتیں موجود ہیں۔ اِسی طرح ماہِ رمضان کے روزے کی فرضیت کے خلاف کوئی موضوع روایت موجود نہیں، البتہ روزے کے فضائل کے بارے میں موضوع روایتیں موجود ہیں، وغیرہ۔

اسلام کی تاریخ میں بعد کے زمانے میں اس طرح کی جو حدیثیں وضع کی گئیں، ان کا مقصد تشویق (motivation) تھا، یعنی کسی عمل کے بڑے بڑے فائدے بتا کر لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرنا۔ اسلام میں وضع کا یہ طریقہ مسیحی قوموں کی مضاہاۃ (9:30) کے طور پر پیدا ہوا۔ مسیحیت میں سینٹ پال کے زمانے میں یہ طریقہ رائج ہوا کہ لوگوں کو مسیحیت کی طرف راغب کرنے کے لیے جھوٹی باتیں وضع کی جائیں۔ (Romans 3:7-8)۔ اِس طریقے کو بعد کی مسیحی روایات میں مقدس فریب (Pious Fraud) کہا جاتا ہے۔ برسبیلِ مضاہاۃ یہ مسیحی طریقہ مسلمانوں میں رائج ہوا۔ یہ طریقہ زیادہ تر مسیحی نومسلموں کے ذریعے اسلام میں داخل ہوا۔

موضوع روایات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لیکن وہ اسلام کے لیے کوئی خطرہ نہیں، کیوں کہ دورِ اول کے محدثین نے کسی حدیث کو قبول کرنے یا رد کرنے کے لیے نہایت محکم اصول بنا دئے ہیں جن کو اصولِ علمِ حدیث کہا جاتا ہے۔ علمِ حدیث ایک مستقل موضوع ہے۔ یہ علم اتنا زیادہ محکم اور منظم بن چکا ہے کہ اس کی روشنی میں کسی بھی روایت کو جانچ کر قطعیت کے ساتھ یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون سی حدیث صحیح ہے اور کون سی حدیث موضوع۔ روایات کو جانچنے کا یہ کام مختلف محدثین نے انجام دیا ہے۔ موجودہ زمانے میں شیخ ناصر الدین البانی (وفات: 1999) اور دوسرے محقق علما نے طویل تحقیق کے بعد اِس کام کو نہایت مستند طور پر انجام دے دیا ہے۔

اِسی طرح دوسرے اجزاء دین کا معاملہ ہے۔ دین کے جو اجزا انسٹی ٹیوشنلائزڈ اسلام کا حصہ بن چکے تھے، ان کے بارے میں کوئی موضوع روایت موجود نہیں، البتہ دوسرے پہلوؤں کے بارے میں کثرت سے موضوع روایتیں پائی جاتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ دین کا وہ حصہ جس کو سنتِ ثابتہ، بالفاظِ دیگر انسٹی ٹیوشنلائزڈ دین کہا جاتا ہے، وہ موضوع روایتوں سے یکسر خالی ہے۔

انسٹی ٹیوشنلائزڈ دین کا حصہ بن جانے کی وجہ سے اِس میں کوئی کمی یا زیادتی کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ البتہ دین کا وہ حصہ جس کا تعلق منفرد اقوال سے ہے، یعنی اُن اقوال سے جو اخبارِ آحاد (احادیث) کی کٹیگری میں آتے ہیں، اُس میں امکانی طور پر ہر قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں۔

نجاتِ فرد، حفاظتِ دین

اسلام کے مطابق، نجات (salvation) کا معاملہ ایک مبنی برفرد معاملہ ہے۔ اسلام میں گروہی نجات کا کوئی تصور نہیں۔ دوسرے الفاظ میں اِس کو پرسنلائزڈ مذہب (personalized religion) کہا جاسکتا ہے۔ اِس معاملے کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق حفاظتِ دین سے ہے۔ دین کی حفاظت انفرادی اسلام کے ذریعے نہیں ہوسکتی۔ اِس کے لیے ضرورت ہے کہ بڑے پیمانے پر اسلام کا ایک اجتماعی ڈھانچہ موجود ہو۔ اسلام کے اِس دوسرے پہلو کو انسٹی ٹیوشنلائزڈ مذہب (institutionalized religion) کہا جاسکتا ہے۔

اِس معاملے کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ صدقہ (charity) ابتدائی طور پر ایک انفرادی معاملہ ہے، یعنی ایک آدمی کا دوسرے آدمی کی مدد کرنا۔ صدقے کی اِس صورت کو انفرادی صدقہ (personal charity) کہا جائے گا۔ صدقے کی دوسری صورت وہ ہے جس کو اجتماعی سطح پر ادا کیا جائے اور اِس طرح بڑے پیمانے پر اس کا ایک نظام بن جائے۔ صدقے کی اِس دوسری صورت کو انسٹی ٹیوشنلائزڈ صدقہ (institutionalized charity) کہا جائے گا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اسلام میں نجات ایک انفرادی واقعے کا نام ہے، لیکن اِسی کے ساتھ اسلام کی ایک ضرورت یہ ہے کہ وہ تاریخ میں مکمل طور پر محفوظ ہوجائے، تاکہ قیامت تک کے لوگ اس کا عملی مشاہدہ کرتے رہیں۔ حفاظتِ دین کی اِس ضرورت کو اسلام میں اِس طرح حاصل کیا گیا کہ اسلام کے مختلف اداروں کے نظام کے ذریعے اس کو ایک انسٹی ٹیوشنلائزڈ دین (institutionalized religion) کی حیثیت دے دی گئی۔ یہی عملی نظام ہے جس نے دینِ اسلام کو محفوظ کرکے اس کو لوگوں کے لیے ایک معروف اور مسلّم حقیقت بنا دیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: إنما الأعمال بالنيات (صحيح البخاري، رقم الحديث: 1) - اِس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دین میں جن اعمال کی تعلیم دی گئی ہے، ان کی قبولیت کا معیار نیت (intention) ہے، جو کہ انسان کی ایک داخلی کیفیت کا نام ہے۔

اِسی طرح حدیث میں آیا ہے: صلوا كما رأيتموني أصلي (صحيح الجامع للألباني، رقم الحديث: 893) یعنی جس طرح تم نے مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، اُسی طرح تم نماز پڑھو۔ اِسی طرح آپ نے فرمایا: خذوا عني مناسككم (مسند احمد، رقم الحديث: 3548) یعنی جس طرح تم نے مجھ کو حج کرتے ہوئے دیکھا، اسی طرح تم حج کرو۔

اِسی طرح اِس مفہوم کی اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی اعمال کا ایک مقرر فارم ہے، یہ فارم لازمی طور پر دینی اعمال کا ناقابلِ تقسیم حصہ ہے، دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جہاں تک خدا کے یہاں اعمال کی قبولیت کا تعلق ہے، اس کا معاملہ عامل کے قلبی اخلاص پر مبنی ہے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (22:37)۔

اِسی بات کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح کہا جا سکتا ہے کہ نجات ایک انفرادی معاملہ ہے جس کا تعلق اصلاً آخرت سے ہے اور حفاظتِ دین ایک اجتماعی معاملہ ہے جو اصلاً موجودہ دنیا کا ایک ظاہر ہے۔ کسی آدمی کی نجات کا تحقق صرف آخرت میں ہوگا۔ لیکن جہاں تک حفاظتِ دین کا معاملہ ہے، اس کی ضرورت موجودہ دنیا کی نسبت سے ہے۔ آخرت میں حفاظتِ دین کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

بے روح اسلام

اہلِ قرآن کہلائے جانے والے لوگوں کا گروپ اگرچہ بظاہر قرآن اور اسلام کا نام لیتا ہے، لیکن غور کیجئے تو اُن کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ حقیقتاً بے روح اسلام (despiritualized Islam) کا ایک ورزن (version) تیار کر رہے ہیں۔ وہ اسلام کا انکار کیے بغیر اسلام کی نفی کر رہے ہیں۔

دین اسلام کی بنیاد ایمان پر ہے۔ ایمان سے مراد وہ معرفت ہے جو آدمی کے اندر اپنے خالق کے بارے میں یقین واعتماد کی کیفیت پیدا کرے، مگر اِن حضرات کا کہنا ہے کہ ایمان سے مراد امن ہے، یعنی دنیوی زندگی میں ایک پرامن معاشرہ (peaceful society) بنانا۔ ایمان کا یہ تصور نہ صرف غیر علمی ہے، بلکہ وہ انسان سے سب سے بڑی چیز چھین لینے والا ہے، اور وہ تعلق باللہ (communion with God) ہے۔

اِسی طرح قرآن میں بار بار اللہ کے لیے رب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ رب کا عقیدہ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے جو انسان کے اندر وہ سب سے بڑی صفت پیدا کرتا ہے جس کو قرآن میں حمد کہا گیا ہے۔ حمد اسپرٹ بلا شبہہ مومن کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ لیکن اہلِ قرآن کا گروپ رب کے لفظ کی تعبیر زمین پر قائم کیے جانے والے نظامِ ربوبیت سے کرتا ہے جو کہ عملاً اشتراکی نظام کے ہم معنی ہے۔ یہ نظریہ مومن سے اس کے اُس عقیدے کو چھین لینے والا ہے جو کہ بلا شبہہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

اِسی طرح تقوی اور خشوع جیسے الفاظ کا معاملہ ہے۔ یہ الفاظ مومن کی اُس داخلی شخصیت کو بتاتے ہیں جس کو قرآن میں ربانیت (3:79) کہا گیا ہے۔ یہ اُس انسان کی اعلیٰ ترین صفت ہے جس کو اللہ رب العالمین کی معرفت حاصل ہو جائے۔ لیکن اہلِ قرآن کا گروپ اس قسم کے الفاظ کی یہ خود ساختہ تعبیر کرتا ہے کہ اس سے مراد دنیوی زندگی میں خدا کے قانون کی خلاف ورزی کے برے نتائج سے بچنا ہے۔

یہی معاملہ عبادات کا ہے۔ قرآن کے مطابق، صلوۃ ایک نہایت اہم عبادت ہے۔ صلوۃ انسان کو اللہ سے قریب کرنے والی ہے۔ انسان جب حالتِ صلوۃ میں ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اللہ کے پڑوس میں پہنچ گیا ہے۔ لیکن اہلِ قرآن کا گروپ خود ساختہ طور پر یہ بتاتا ہے کہ صلوۃ کا مطلب دنیا کی زندگی میں اجتماعی قوانین کی پابندی ہے۔ اِس طرح یہ نظریہ بندے اور خدا کے درمیان اُس اعلیٰ تعلق کو ختم کر دیتا ہے جس کو قرآن میں حب شدید (2:165) کہا گیا ہے۔

اِسی طرح قرآن کے مطابق، بندے کی ایک عبادت صوم ہے۔صوم کی اصل حقیقت یہ ہے کہ بندہ عمل کی زبان میں یہ بتاتا ہے کہ وہ اللہ کے لیے (for the sake of God) اپنی بنیادی ضرورت تک کو چھوڑ سکتا ہے۔ یہ بندے کی طرف سے اپنے رب کے لیے وفاداری کا آخری مظاہرہ ہے جو کہ بندے کے مقامِ عبدیت کو بہت زیادہ بڑھانے والا ہے۔لیکن اہلِ قرآن کا گروپ روزہ (fasting) کے بجائے صوم کا مطلب یہ بتاتا ہے کہ اس سے مراد دنیوی زندگی میں قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے بچنا ہے۔ یہ خود ساختہ تعبیر مومن کو اُس عظیم روحانی تجربے سے محروم کرنے والی ہے جس کو قرآن میں دعاءِ قربت (2:186) کہا گیا ہے۔

یہی معاملہ دوسری عبادات کا ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے کچھ مسلم اہلِ فکر نے اسلام کی مبنی بر نظام تعبیر (system-based interpretation) پیش کی، جب کہ اسلام کی ربانی تعبیر ہی اس کی صحیح تعبیر ہے۔ اہلِ قرآن گروپ کا کیس یہ ہے کہ وہ اسلام کی مبنی بر نظام تعبیر سے متاثر ہوا، اور اس میں اپنی طرف سے مزید اضافہ کرکے اس کے بگاڑ کو اس کی آخری حد تک پہنچا دیا۔

قرآن کا اصل مدعا وہی ہے جس کو قرآن کی پہلی آیت میں بیان کیا گیا ہے، یعنی الحمد اللہ رب العالمین۔ یہی قرآن کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔قرآن کا مدعا یہ ہے کہ انسان رب العالمین کو اس کی صفاتِ کمال کے ساتھ دریافت کرے، وہ ایک ربانی انسان بن جائے۔اس کی شخصیت میں وہ انقلاب آئے جب کہ وہ پورے معنوں میں حمد اسپرٹ میں جینے لگے۔

یہی قرآنی تعلیمات کا ماحصل (gist) ہے۔ جب ایک انسان کے اندر یہ صفت پیدا ہوتی ہے تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر اس کی زندگی میں تزکیہ کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ وہ اللہ کی یاد میں جینے لگتا ہے، وہ اللہ کا عبادت گزار بندہ بن جاتا ہے۔اس کے سوچنے اور اس کے بولنے پر اللہ کا رنگ چھا جاتا ہے، اس کے اخلاق اور اس کے معاملات اللہ کی مرضی کے تابع بن جاتے ہیں، اس کی پوری زندگی اس حقیقت کا اظہار بن جاتی ہے کہ اس کو اللہ کے سامنے اپنے تمام

اعمال کا جواب دینا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں یہی ربانی انسان ہے، اور اِسی قسم کا انسان بنانا قرآن کا اصل نشانہ ہے۔

عبادات کی اصولی حیثیت

جولوگ ایسا کرتے ہیں کہ وہ قرآن میں مذکور نماز اور دوسری عبادات کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو علمی اجماع اور عملی تواتر کے ذریعے ثابت شدہ تعبیر کے خلاف ہے، ان کے شعور یا لاشعور میں غالباً ایک تحفظ (reservation) موجود ہوتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ بے شمار مسلمان مسجدوں میں جمع ہوکر نمازیں ادا کررہے ہیں، لیکن اِن مسلمانوں کی زندگیوں میں اِس کا کوئی صالح نتیجہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے وہ عبادت کی دوسری دوسری تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اقامتِ صلوۃ کا مطلب معروف نماز نہیں، بلکہ سوشل ورک ہے، وغیرہ۔

یہ سوچ درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اِس معاملے کو باعتبار حقیقت، صرف نظری اصول (theoretical criterion) کی بنیاد پر دیکھا جائے گا، نہ کہ عملی نتیجہ (practical result) کی بنیاد پر۔ اِس کا سبب انسان کی آزادی ہے۔ خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan) کے مطابق، انسان کو اِس دنیا میں اختیار کی آزادی (freedom of choice) حاصل ہے۔ ایسی حالت میں انسان کو صرف اصول بتایا جاسکتا ہے۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے، وہ تمام تر انسان کے اپنے ارادہ (will) پر منحصر ہے۔ آدمی اگر چاہے گا تو وہ ایسی عبادت کرے گا جو مطلوب نتیجے کے مطابق ہو، اور اگر وہ نہ چاہے تو وہ یہ بھی کرسکتا ہے کہ وہ سرے سے عبادت نہ کرے، یا یہ کہ وہ فارم (form) کے اعتبار سے بظاہر عبادت کرے، لیکن اس کی عبادت میں عبادت کی روح (spirit) شامل نہ ہو۔ اِس بنا پر عبادت کے معاملے میں صرف یہ ممکن ہے کہ اس کا اصل حکم بیان کیا جائے، نتیجے کو انسان کی آزادی کا معاملہ سمجھا جائے، نہ کہ خود عبادت کی اصولی حیثیت کا معاملہ۔

پیغمبر کی اہمیت

ایک صاحب جو اہلِ قرآن کہلائے جانے والے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے

میری گفتگو ہوئی۔انھوں نے کہا— کہ ہم یہ مانتے ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے،لیکن قرآن کو درست طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن کو دوسری تمام چیزوں سے الگ (detach) کرکے دیکھا جائے،تاریخ کو،حدیث کو،تفسیر کو،حتی کہ خود محمد کو بھی حذف کرکے دیکھا جائے،تب قرآن سمجھ میں آئے گا۔ انھوں نے کہا کہ قرآن کو صرف قرآن کے ذریعے سمجھنا ہے،نہ کہ کسی اور چیز کے ذریعے۔

یہ بات بظاہر گریمر کے لحاظ سے درست ہے،لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر بے بنیاد ہے۔حقیقت یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حذف کرنے کے بعد خود قرآن کو حذف کرنا پڑے گا،کیوں کہ قرآن ہمارے پاس براہِ راست نہیں آیا،بلکہ اُس انسان کے ذریعے آیا جس کا نام محمد بن عبد اللہ تھا،جو 570 میں مکہ میں پیدا ہوا اور 632 میں جس کی مدینے میں وفات ہوئی۔اس انسان کی قبر اب بھی اس کی تاریخی یادگار کے طور پر مدینے میں موجود ہے۔عرب میں پیدا ہونے والے اِس انسان نے جب کہا کہ یہ قرآن ہے جو وحی کے ذریعے مجھ پر نازل ہوا ہے،اس کے بعد ہی قرآن قرآن بنا۔اگر اس انسان نے ایسا نہ کہا ہوتا تو قرآن کو قرآن سمجھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی بنیاد ہی موجود نہ ہوتی۔حقیقت یہ ہے کہ محمد بن عبد اللہ کو ماننا ہی ہم کو قرآن کو ماننے کے لیے نقطۂ آغاز دیتا ہے۔اِس معاملے میں اگر ہم محمد بن عبد اللہ کو حذف کریں تو اِس سے پہلے خود قرآن حذف ہو چکا ہوگا۔ظاہر ہے کہ ہم اِس قسم کے قول کا تحمل نہیں کر سکتے۔

پھر یہ بات محمد بن عبد اللہ پر ختم نہیں ہوتی۔سوال یہ ہے کہ محمد بن عبد اللہ کے ظہور کے چودہ سو سال بعد جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے،وہ ہم کو کیسے ملا۔وہ اِس طرح ملا کہ رسول کے اصحاب نے محمد بن عبد اللہ کی زندگی میں براہِ راست طور پر اُن سے قرآن کو سنا اور اس کو حفظ و کتابت کے ذریعے محفوظ کر دیا۔اس کے بعد تابعین کے گروہ نے اصحابِ رسول سے اُس کو براہِ راست طور پر سنا اور پھر حفظ و کتابت کے ذریعے اس کو محفوظ کر لیا۔یہی کام دوبارہ تبع تابعین کے گروہ نے کیا۔اِس کے بعد یہی طریقہ مسلسل طور پر نسل در نسل جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔انیسویں صدی میں مزید یہ ہوا کہ قرآن کو پرنٹنگ پریس میں چھاپا گیا اور اس کے مطبوعہ نسخے ساری دنیا میں پھیلا دیے گئے۔

قرآن کے معاملے میں اللہ کی حیثیت منزّلِ کتاب کی ہے اور رسول کی حیثیت راویِ کتاب کی اور امت کی حیثیت ناشرِ کتاب کی۔ یہ ایک طویل تاریخی سلسلہ ہے۔ اِس تاریخی سلسلے نے قرآن کو آخری حد تک محفوظ اور مستند کتاب بنا دیا ہے۔ مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اللہ نے محمد بن عبداللہ کو قرآن کا مہبط بنایا۔ یہ بلاشبہہ روبوٹ (robot) جیسا کوئی معاملہ نہ تھا۔

قرآن کے مطابق، اللہ کو یہ مطلوب تھا کہ قرآن سارے انسانوں تک قابلِ فہم انداز میں پہنچے۔ اِس مصلحت کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ اللہ ایسے انسان کو قرآن کا مہبط بنائے جو خود قرآن کو درست طور پر سمجھے اور اس کو درست طور پر دوسروں تک منتقل کرے۔

اِس حکمت کے لازمی تقاضے کے طور پر سنت وجود میں آئی۔ سنت گویا صاحبِ قرآن کی زبان سے قرآن کی مستند تفہیم وتشریح ہے۔ جس طرح محمد بن عبداللہ کو حذف کرنے سے قرآن حذف ہوجاتا ہے، اِسی طرح سنت کو حذف کرنے سے قرآن کی مستند تفہیم وتشریح حذف ہوجاتی ہے اور جب قرآن اور اس کی مستند شرح دونوں حذف ہوجائیں تو اس کے بعد علمی اعتبار سے، انسان کے پاس کوئی مستند بنیاد باقی نہیں رہتی جس پر وہ حقیقتِ حیات کو جاننے کے لیے اعتماد کر سکے۔

تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ جس طرح قرآن ایک تسلسل کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، اُسی طرح قرآن کی پیغمبرانہ تفہیم وتشریح بھی سنت کی شکل میں ایک قابلِ اعتماد تسلسل کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، خالص علمی اور تاریخی اعتبار سے، دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

قرآن دینِ اسلام کی واحد مستند کتاب ہے۔ لیکن قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں دین کے صرف اساسی اصول (fundamentals) بیان ہوئے ہیں۔ قرآن میں کسی بھی حکم کی تفصیل (detail) موجود نہیں۔ اِس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ احکامِ قرآن کی تفصیل بھی موجود ہو، کیوں کہ انسان جیسی مخلوق کے لیے کسی حکم کی تفصیل جانے بغیر اس پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ سنت کی حیثیت قرآن کے احکام کی اِسی تفصیل اور تبیین کی ہے۔

اِسی کے ساتھ یہ بھی ایک معلوم بات ہے کہ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ اِس لیے ہر دور میں

نیے تقاضے سامنے آتے ہیں۔ یہ زمانی تقاضے اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہمیشہ اضافی (relative) ہوتے ہیں، وہ حقیقی (real) نہیں ہوتے۔ اِس لیے بدلے ہوئے حالات میں نئی کتاب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو ضرورت ہوتی ہے، وہ صرف یہ کہ حالات کے مطابق، اصل کتاب کی تعلیمات کا دوبارہ انطباق (reapplication) تلاش کیا جائے۔ مہبطِ قرآن کے بعد یہ سلسلہ بعد کی تاریخ میں برابر جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔ البتہ پیغمبر کی تشریح اور بعد کے علما کی تشریح میں ایک اصولی فرق موجود ہے، وہ یہ کہ پیغمبر کی تشریح کی حیثیت مستند تشریح کی ہوگی، جب کہ بعد کے علما کی تشریح کی حیثیت صرف اجتہادی تشریح کی۔

قرآن اور پیغمبر

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حذف (detach) کر کے قرآن کو سمجھیں گے وہ اپنے اِس قول سے صرف یہ بتا رہے ہیں کہ وہ قرآن کی اسکیم سے مکمل طور پر بے خبر ہیں۔ پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی اسکیم کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ پیغمبر کے بغیر قرآن کو سمجھنے کا دعوی کرنا بلا تشبیہہ ایسا ہی ہے جیسے البرٹ آئن سٹائن کو حذف کر کے نظریہ اضافیت (theory of relativity) کو سمجھنا ممکن نہیں ہے، اسی طرح پیغمبر کے بغیر قرآن کو سمجھنا سرتاسر ناممکن ہے۔

مثال کے طور پر قرآن میں بار بار اُن نبیوں کا حوالہ دیا گیا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دنیا میں آئے۔ یہ تمام پیغمبر جدید انسان کی نسبت سے، صرف ایک مذہبی عقیدہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی حیثیت تاریخی پیغمبر (historical prophet) کی نہیں۔ کیوں کہ مدوَّن تاریخ (recorded history) میں ان پیغمبروں کا حوالہ (reference) موجود نہیں ہے۔

قرآن کی دعوت میں مدعو کی نسبت سے، گویا یہ ایک خلا پایا جاتا تھا۔ یہاں مدعو کہہ سکتا تھا کہ قرآن جن پیغمبروں کا حوالہ دے کر اپنی بات پیش کرتا ہے، ان کا ریکارڈ مدون تاریخ میں موجود نہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مدعو کی اس بات کا محکم جواب ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آئے کہ آپ کی ذات اور آپ کا

مشن مدون تاریخ کا حصہ بن گیا۔ ایک مستشرق (orientalist) نے اِس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

Muhammad was born within the full light of history.

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی وہ خاص حیثیت ہے جس کو قرآن میں مقامِ محمود (17:79) کا عنوان دیا گیا ہے۔ ''مقامِ محمود'' سے مراد تاریخی مقام یا تاریخی پیغمبر ہے۔ پیغمبر اسلام نبیوں کے سلسلے کی تاریخی تکمیل ہیں۔ محمود کا لفظی مطلب ہے: تعریف کیا ہوا یا اعتراف کیا ہوا۔ یہاں تاریخی پیغمبر سے مراد ہے — نبیِ معترَف (historically acknowledged prophet)۔

ایک حدیث رسول میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں کی عظیم عمارت کا ایک 'لَبِنة' (صحيح البخاري، رقم الحديث: 3535) ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ نبیوں کی طویل فہرست کے باوجود مدعو کی نسبت سے، بظاہر ایک کمی پائی جاتی تھی، وہ یہ کہ پچھلے انبیا اللہ کے سچے رسول ہونے کے باوجود مورخین کے ریکارڈ میں درج نہ ہو سکے۔ گویا خالص مورخانہ اعتبار سے، یہ انبیا صرف اعتقادی انبیا تھے، وہ تاریخی انبیا نہ تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن استثنائی طور پر ایک ایسا مشن تھا جو مورخین کے معیار کے مطابق، عالمی تاریخ میں ریکارڈ ہو گیا۔ اِس طرح پیغمبر اسلام کے ذریعے استثنائی طور پر ایک تاریخی پیغمبر (historical prophet) وجود میں آیا۔ اِس طرح یہ ہوا کہ نہ صرف پیغمبر اسلام ایک تاریخی پیغمبر بن گئے، بلکہ آپ کے سوا دوسرے پیغمبروں کی حیثیت بھی اصولی طور پر تاریخی پیغمبر کی ہوگئی، پیغمبر اسلام اگر اِس تاریخی فہرست کا براہِ راست حصہ تھے تو دوسرے تمام پیغمبر اِس تاریخی فہرست کا بالواسطہ حصہ۔

قرآن اور سنتِ متواترہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے جو دین ہم کو ملا ہے، بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں ہیں — قرآن اور سنتِ متواترہ۔ سنتِ متواترہ عملاً اُس دینِ اسلام کا مستند حصہ بن چکی ہے جس کو ہم نے انسٹی ٹیوشنلائزڈ اسلام کہا ہے۔ یہ اُسی طرح قابلِ اتباع ہے، جس طرح قرآن کی آیات۔

سنتِ متواترہ کے سلسلے میں اب ہم کو صرف اتباع کرنا ہے، نہ کہ اُس پر بحث کرنا۔

جہاں تک اخبارِ آحاد (احادیث) کا تعلق ہے، اُن کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے۔ اخبارِ آحاد عملاً ظنی کے حکم میں ہیں، لیکن ظنی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ موضوع روایت کی طرح قابلِ رد ہیں۔ ظنی کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ تحقیقِ مزید کا موضوع (subject to rechecking) ہیں، اور جب تحقیق کے ذریعے اخبارِ آحاد کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو وہ بلاشبہہ دوسری صحیح احادیث کی طرح قابلِ اتباع ہو جائیں گی۔ اِس معاملے میں یہی جمہور کا مسلک ہے۔ (حدیث الآحاد حجة، یجب العمل به إذا صحّ، وعلی هذا جمهور المسلمین)

عبادت اور عملی تواتر

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ عبادت انسان کی تخلیق کا اصل مقصد ہے (51:56)۔ قرآن میں بار بار اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے (2:21)۔ انسان سے جو اصل چیز مطلوب ہے، وہ یہی عبادت ہے۔ اللہ معبود ہے اور انسان اس کا عابد۔ اِسی عبادتی تعلق کی درستگی پر دین کا مدار ہے۔

عبادت کی اصل روح ایک ہے، اور وہ ہے اپنے آپ کو آخری حد تک جھکانا اور پست کرنا (أصل العبودية: الخضوع والتذلل)۔ اِس روح عبادت کا اظہار مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ اِن میں سے ایک صلوۃ (نماز) ہے۔ صلوۃ کی اصل حقیقت خشوع (23:2) ہے۔ لیکن صلوۃ کا ظاہری فارم بھی اِس خشوع کا ایک لازمی حصہ ہے، جیسا کہ انسان کے وجود میں روح کے ساتھ جسم اس کی شخصیت کا ایک لازمی اور ناقابلِ تقسیم حصہ ہوتا ہے۔

موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ظاہر ہوا ہے جو کہتا ہے کہ پنج وقتہ نماز کا موجودہ نظام تدوینِ حدیث کے بعد وجود میں آیا ہے۔ یہ نظریہ سرتاسر بے بنیاد ہے، تاریخ ہرگز اِس نظریے کی تائید نہیں کرتی۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز کا موجودہ نظام اگر حدیث کی تدوین کے بعد قائم ہوتا تو وہ سرے سے قائم ہی نہ ہوتا۔ پنج وقتہ نمازوں کا موجودہ نظام اِسی وجہ سے قائم ہے کہ وہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں باقاعدہ طور پر وجود میں آچکا تھا اور اس کے بعد وہ تاریخ میں بلا انقطاع مسلسل طور پر جاری رہا۔

تاریخ کے مطابق، احادیث رسول کی جمع وتدوین عملاً تیسری صدی ہجری میں عباسی دور میں ہوئی۔ حدیث کی جمع وتدوین سے پہلے پنج وقتہ نمازوں کا نظام بن چکا تھا۔ لوگ مسجدوں میں روزانہ جماعت کے ساتھ مقرر اوقات پر نماز ادا کر رہے تھے۔ نماز باجماعت کا یہ نظام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قائم ہو چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: صلوا کما رأیتموني أصلي (صحیح الجامع للألباني، رقم الحدیث: 893)۔

یہ حدیث اپنی حقیقت کے اعتبار سے، صرف ایک امرِ رسول نہیں ہے، بلکہ وہ ایک امر فطرت ہے۔ نماز جیسی عبادت جس کا ایک فارم ہو، وہ دیکھے بغیر ہرگز ادا نہیں کی جاسکتی۔ ضروری ہے کہ اس کا ایک ماڈل موجود ہو جس کو دیکھ کر لوگ اُسی طرح اس کو دہراتے رہیں۔ اِس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، وہ یہ تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہجرت کے بعد مسجد کی تعمیر ہوئی اور اس میں نماز باجماعت قائم کی گئی۔ یہ واقعہ خود قرآن (9:108) سے ثابت ہے۔

آپ کے صحابہ (ہم عصر اہلِ ایمان) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو براہِ راست طور پر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور اِسی نمونۂ رسول کے مطابق انھوں نے نمازیں ادا کیں۔ اس کے بعد اگلی نسل (تابعین) نے صحابہ کو دیکھا اور ان کے نمونے کے مطابق، انھوں نے نمازیں ادا کیں۔ اس کے بعد مسلمانوں کی تیسری نسل (تبع تابعین) نے تابعین کو دیکھا اور ان کے نمونے کے مطابق انھوں نے نماز ادا کی۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہا اور اگلی نسل کے لوگ پچھلی نسل کے لوگوں کو دیکھ کر بڑی تعداد میں اجتماعی طور پر مقرر اوقات میں نماز ادا کرتے رہے۔ یہ سلسلہ اب تک بلا انقطاع جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ حدیثوں کی جمع وتدوین کے بعد نمازیں شروع ہوئیں، یہ ایک سرتاسر بے بنیاد (baseless) بات ہے۔ نماز ایک عملی عبادت ہے، وہ صرف حدیثوں کو پڑھ کر ادا نہیں کی جاسکتی۔ حدیثوں کو پڑھ کر زیادہ سے زیادہ نماز کا ایک نظریاتی تصور (theoretical concept) بن سکتا ہے، مگر صرف نظریاتی تصور سے عملی عبادت ادا نہیں کی جاسکتی۔ نماز کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا ایک عملی نمونہ (practical model) موجود ہو۔

یہ صحیح ہے کہ حدیثوں میں نماز کے طریقے اور آداب کا ذکر بطور اصول کیا گیا ہے، لیکن یہ نماز کا صرف ایک نظریاتی بیان (theoretical description) ہے۔ اور صرف نظریاتی بیان نماز کی عملی ادائیگی کے لئے کافی نہیں۔ بالفرض اگر حدیث کی جمع وتدوین سے پہلے نماز کا عملی نمونہ موجود نہ ہوتا اور لوگ حدیثوں کو پڑھ کر نماز ادا کرنا شروع کرتے تو ناممکن تھا کہ نماز کا کوئی واحد عملی نظام بن سکے۔ ایسی حالت میں عملی طور پر نماز کی اتنی زیادہ صورتیں ہوتیں کہ جتنے زیادہ آدمی اتنی ہی زیادہ نماز کی صورتیں۔ اِس طرح عبادت کا ایک جنگل تو وجود میں آسکتا تھا، لیکن عبادت کا ایک یکساں نظام (uniform system) قائم ہونا ہرگز ممکن نہ تھا۔

خلاصۂ بحث

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن اپنے الفاظ کے اعتبار سے بھی محفوظ ہے اور اِسی طرح قرآن کے معنی اور مفہوم بھی پوری طرح محفوظ ہیں۔ حفاظت کا یہ معاملہ براہِ راست طور پر خدا کے فیصلے کے تحت ہوا ہے۔

اب اگر اکیسویں صدی میں کوئی شخص اٹھے اور کہے کہ امت مسلمہ قرآن کے الفاظ کے جو معنی اب تک سمجھتی رہی ہے، وہ غلط ہے، یا مفسرین، قرآن کے الفاظ مثلاً صلوۃ اور زکوۃ اور حج، وغیرہ کے جو معنی بتاتے رہے ہیں، وہ درست نہیں، تو اِس قسم کا بیان کوئی سادہ بیان نہیں۔ وہ براہِ راست طور پر اللہ کے فیصلے کو چیلنج کرنے کے ہم معنی ہے، وہ عملاً خود قرآن کی تردید ہے۔

اِس دنیا میں اللہ نے ہر انسان کو آزادی دی ہے۔ اِس بنا پر ایک انسان یہ کرسکتا ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں قرآن کو نہیں مانتا، لیکن یہ حق کسی کو حاصل نہیں کہ وہ قرآن کو مانے اور پھر یہ کہے کہ قرآن کے معنی بعد کے زمانے میں بدل گئے۔

قرآن کی حفاظت کے لیے اللہ تعالی نے ایسا محکم انتظام کیا ہے کہ اس میں کوئی بھی شخص کسی قسم کی تبدیلی نہ کرسکے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ کسی بھی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ تاریخ کے درمیان میں اٹھے اور قرآن کے معنوی تواتر کو توڑ دے۔ قرآن میں اِس قسم کی مداخلت (intervention)

کا مطلب یہ ہوگا کہ بعد کی نسلوں کے لیے قرآن درست طور پر قابلِ فہم نہ رہے۔ اگر ایسا ہوتو اس کا مطلب نعوذ باللہ، یہ ہوگا کہ قرآن کی حفاظت کے بارے میں اللہ کا فیصلہ باطل قرار پا گیا، وہ پوری تاریخ میں جاری نہ رہ سکا۔

قرآن کو ماننے یا نہ ماننے کا تعلق انسان کی شخصی آزادی سے ہے، جس کا حق ہر ایک کو فطری طور پر حاصل ہے، لیکن قرآن کی تاریخی محفوظیت کا تعلق تمام تر علم سے ہے اور علم کے معاملے میں کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر ایک ایسا بیان دے جس کی تصدیق علم کے مسلّمہ اصولوں سے نہ ہوتی ہو۔

پہلی بات کا تعلق انسان کی اپنی آزادی سے ہے۔ ہر انسان کو پیدائشی طور پر یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرے اور چاہے تو ذاتی دائرے میں وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے۔ لیکن جہاں تک علم کے اُن اصولوں کا تعلق ہے جو اپنی تاریخ کے نتیجے میں یونی ورسل نارم (universal norms) کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، اُن میں کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ اُن کو نہ مانے یا خود ساختہ طور پر وہ ان کا نیا مفہوم بیان کرے۔

بھوپال میں ماہ نامہ الرسالہ اور مطبوعات الرسالہ اور دعوتی لیٹریچر حسب ذیل پتے پر دستیاب ہیں:

Mr. Bilaluddin
Al-Quran Mission
48, Aamwali Masjid, Jahangirabad, Bhopal (M.P.)
Mob. 09755300295, 07556542231

بہار میں ماہ نامہ الرسالہ، مطبوعاتِ الرسالہ اور دعوتی لٹریچر حسب ذیل پتے پر دستیاب ہیں:

A. H. M. Danyal
(President, Centre for Peace)
Mahatwana, Phulwarisharif
Patna-601505, Bihar
Mob. 09308477841, 09852208744

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔ الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1۔ الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 33 فی صد ہے۔ 50 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 40 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ 2۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ 3۔ کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تین مہینے تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرتعاون الرسالہ

ہندستان کے لئے		بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک)
ایک سال	Rs. 150	$20
دو سال	Rs. 300	$40
تین سال	Rs. 450	$60

Rahnuma-e-Zindagi
by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Tuesday-Friday 5.00 am

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan/Maria Khan
ETV Urdu
Every Sunday 9.00 am

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2012-14
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2012-14

اظہارِ دین

دورِ حاضر کی نسبت سے اسلام کو سمجھنے کے لیے ایک جامع کتاب

از: مولانا وحید الدّین خاں

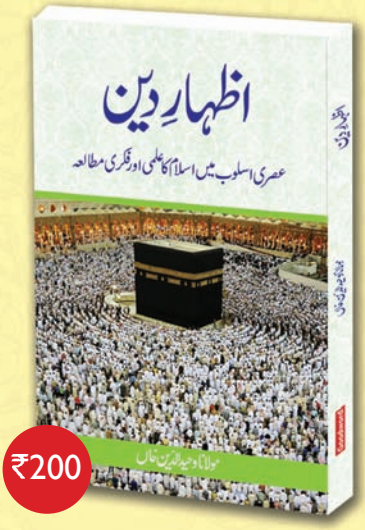

دورِ حاضر اپنی حقیقت کے اعتبار سے، دورِ اسلام ہے۔ دورِ حاضر کی علمی ترقیوں نے اسلام کی عالمی اہمیت کو ازسرِ نو واضح کیا ہے۔ سائنس اسلام کا علمِ کلام ہے۔

دورِ جدید کو ایک آئڈیالوجی کی ضرورت ہے۔ اسلام اِسی آئڈیالوجی کا دوسرا نام ہے۔ روحِ عصر سب سے زیادہ جس چیز کی طالب ہے، وہ بلاشبہہ دینِ اسلام ہے۔ اسلام دنیا اور آخرت کی سعادتوں کے لیے ایک مستند گائڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام اپنے نظریے کے اعتبار سے، مبنی بر توحید دین ہے اور اپنے طریقِ کار کے اعتبار سے، مبنی بر امن دین — عصری اسلوب میں اسلام کے اِن تمام پہلوؤں کو جاننے کے لیے 'اظہارِ دین' کا مطالعہ کیجئے۔

Pages: 720